جلد نمبر 3
شمارہ نمبر 2
جنوری 2022
المنار
مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس شمارے میں

پتہ برائے خط وکتابت

editorAlmanar@gmail.com

Click Here to visit TICAA USA **Website**

Click her to visit us on **facebook**

یٰاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِیۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَہَالَۃٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِیۡنَ ﴿49:7﴾

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے پاس اگر کوئی بد کردار کوئی خبر لائے تو (اس کی) چھان بین کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تم جہالت سے کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو پھر تمہیں اپنے کیے پر پشیمان ہونا پڑے۔ (الحجرات۔۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اسلام میں بری روایت جاری کرے گا تو اسے اپنے گناہ کے علاوہ ان لوگوں کے گناہ میں سے بھی حصہ ملے گا جو اس پر عمل پیرا ہوں گے بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں سے کوئی کمی کی جائے۔

(صحیح مسلم کتاب الزکوۃ باب الحث علی الصدقۃ)

ڈاکٹر ساجد علی

اقلیتوں کے مساوی حقوق کا مسئلہ

تیس برس سے زیادہ پرانی بات ہے وی سی آر پر مشہور زمانہ سیریز سٹار ٹریک کی ایک قسط دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس قسط میں ایک شخص سپیس شپ میں آ جاتا ہے جس کی سر سے پاؤں تک ایک سائیڈ سفید اور دوسری سیاہ ہوتی ہے۔ وہ پناہ کا طالب ہوتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد اسی طرح کا سفید و سیاہ ایک اور فرد سپیس شپ میں آتا ہے۔ وہ اس پہلے شخص کو اپنے حوالے کرنے کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ وہ ان کا مفرور مجرم ہے۔ کپتان کے پوچھنے پر وہ بتاتا ہے کہ یہ مخالف نسل کا فرد ہے جن سے ان کی جنگ چل رہی ہے۔ کپتان حیران ہو کر پوچھتا ہے مخالف نسل سے کیا مراد ہے۔ وہ بھی تمھاری طرح آدھا سفید اور آدھا سیاہ ہے۔ تو وہ بہت غصے سے جواب دیتا ہے کیا تم اندھے ہو۔ تمھیں فرق دکھائی نہیں دیتا؟ اس کی بائیں جانب سیاہ ہے اور میری دائیں۔

یہ تو تھی فلم کی بات لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کرہ ارض پر انسانوں کے مابین اپنے اور پرائے کی تقسیم بہت پرانی ہے۔ یہ فرق و امتیاز بعض اوقات کس قدر مضحکہ خیز ہو جاتا ہے اس کا ایک طنزیہ نمونہ ہمیں کرشن چندر کے ناول غدار میں، جو تقسیم ہند کے وقت پنجاب میں ہونے والے فسادات کا بیان ہے، ملتا ہے: ہندو اور سکھ جو ادھر سے لٹ لٹا کر آتے ہیں انھیں شرنارتھی کہا جاتا ہے اور ادھر سے جو مسلمان لٹ لٹا کر ادھر جاتے ہیں انھیں مہاجر کہا جاتا ہے۔ ہندو کبھی مہاجر نہیں ہو سکتا اور مسلمان کبھی شرنارتھی نہیں ہو سکتا۔ شدید سے شدید تکلیف میں بھی یہ تفریق روا رکھی جاتی ہے۔

شناخت اور امتیاز کا یہ مسئلہ کس قدر اہمیت اختیار کر لیتا ہے اس کی ایک مثال ہمیں مرحوم یوگوسلاویہ میں ملتی ہے جہاں ہونے والی قتل و

غارت گری بیسویں صدی کے اواخر کا ایک بھیانک واقعہ ہے۔ اگر اس سانحے کے اسباب کی پڑتال کی جائے تو عجیب و غریب صورت حال سے واسطہ پڑتا ہے۔ مارشل ٹیٹو کے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد جب 1946 میں وہاں نیا آئین نافذ کیا گیا تو اس میں پانچ قومیتوں کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس میں سابقہ حکومتوں کی طرح بوسنیا کے مسلمانوں کو علیحدہ گروہ تو سمجھا جاتا تھا لیکن ان کی کوئی قومی شناخت نہیں تھی۔ بوسنیا کے مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ انھیں علیحدہ قومیت کے ساتھ مذہبی گروپ کے طور پر بھی شناخت کیا جائے۔ بائیس سال کی جدوجہد کے بعد 1968 میں بوسنیا کے مسلمانوں کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔

ارنسٹ گیلنر کا کہنا ہے کہ بوسنیا میں جو لوگ خود کو مسلمان کے طور پر رجسٹر کروا رہے تھے ان کی بڑی تعداد اعتقاداً اسلام کو ترک کر چکی تھی، اور وہ باعمل مسلمان بھی نہیں تھے۔ ان کا اصل مطالبہ قومی شناخت کا تھا۔ وہ سربو کروئیٹ زبان بولنے والے سلاف نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کا مسلم ثقافتی پس منظر تھا۔ وہ خود کو سرب نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس کا مطلب لیا جاتا کہ وہ آرتھوڈوکس چرچ کے ماننے والے ہیں۔ اگر خود کو کروئیٹ کہتے تو سمجھا جاتا کہ وہ رومن کیتھولک چرچ کے پیروکار ہیں۔ خود کو یوگوسلاوی کہنا بہت ہوائی سی بات دکھائی دیتی تھی۔ چونکہ نسلی یا ثقافتی شناخت مذہبی شناخت سے جداگانہ نہ تھی اس لیے انھیں اس اسلام کو اپنی قومی شناخت کی بنیاد بنانا پڑا جسے عملاً وہ چھوڑ چکے تھے۔

جدید دنیا میں انسانی آبادی اس قدر مختلط ہو چکی ہے کہ بعض اوقات کسی واحد شناخت سے کام نہیں چل سکتا۔ مذہب اور ثقافت ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ انھیں جدا کرنا ممکن نہیں ہوتا اور نہ محض ایک کا حوالہ مکمل شناخت بیان کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس کا ایک بیان چیخوف کے ڈرامے "تین بہنیں" میں ملتا ہے۔ اس کا ایک کردار لیفٹیننٹ توزن باخ ہے جس کا نام غمازی کرتا ہے کہ وہ جرمن نسل سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ خود کو روسی ثابت کرنے کے لیے کہتا ہے:

"میرے خیال میں آپ سوچ رہے ہیں کہ میں جذباتی سا جرمن ہوں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جرمن نہیں۔۔ میں روسی ہوں۔ مجھے جرمن زبان کا ایک لفظ نہیں آتا۔ میرا باپ آرتھوڈوکس مسیحی ہے۔" (اردو ترجمہ از محمد سلیم الرحمان۔ آخری جملے کے ترجمے میں تبدیلی کی گئی ہے۔) اسے پتہ ہے کہ اپنے نام کی وجہ سے وہ سلاف نسل سے ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسے روسی زبان بولنے کے ساتھ آرتھوڈوکس چرچ کا بھی حوالہ دینا پڑتا ہے۔

برصغیر ہند میں بھی یہ مسئلہ پیدا ہوا اور اس کا نتیجہ ہم تقسیم کی صورت میں بھگت چکے ہیں۔ کرشن چندر اپنے ناول غدار میں کہتا ہے کہ "فرقہ وارانہ تحریکوں نے گزشتہ پچاس سال سے پنجاب کی فضا کو متعفن کر رکھا تھا"۔

پنجاب کی اس فضا کو مکدر کرنے میں مسلمانوں کا ہی حصہ نہیں تھا بلکہ دوسرا فریق بھی برابر کا شریک تھا۔ آغا شورش کاشمیری نے اپنی کتاب "چہرے" میں پرتاپ اخبار کے مدیر مہاشہ کرشن کا چہرہ ان الفاظ میں لکھا ہے۔ واضح رہے آغا صاحب مسلم لیگی نہیں، بلکہ احراری تھے۔

"الف تا یے ہندو، مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو، انگریزوں کے مقابلے میں نیشنلسٹ، وہ اسی حد تک قوم پرور تھے، جہاں تک انگریزی اقتدار کے بندھنوں کو توڑنے کا سوال تھا، جہاں مسلمانوں کے وجود کا سوال ہوتا وہاں وہ سر تا پا ہندو تھے۔

جن لوگوں کی احوال و کوائف پر نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ ملاپ اور پر تاپ ہی وہ اخبار تھے، جنھوں نے مسلمانوں کے فرقہ وارانہ ذہن کو انگیزا، اگر یہ دو اخبار نہ ہوتے تو شاید شمالی ہندوستان کی سیاست کا رخ مختلف ہوتا، لیکن ان دو اخباروں نے مسلمانوں اور ہندووں میں منافرت کی دیواریں کھینچنے میں فی الواقع کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، ان کے قلم میں آج بھی سیوا جی کے گھاؤ چھپے ہوتے ہیں۔"

برصغیر میں ہندو مسلم تفریق کے پیدا ہونے کا بڑا سبب ہندوستان میں انگریزوں کی آمد تھی۔ اس وقت یورپ میں نیشنل ازم کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔ جدید انگریزی تعلیم پانے والے ہندوستانی بھی اس فلسفے سے متاثر ہوئے اور ان میں بھی قوم پرستی کے جذبات پیدا ہونے لگے۔

نیشنل ازم کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی کوئی متفقہ تعریف آج تک بیان نہیں ہو سکی۔ اصلاً اس کا شمار ان تصورات میں ہوتا ہے جنھیں Essentially contested concepts کہا گیا ہے۔ قوم بنانے کا کوئی عقلی منطقی اصول نہیں ہے۔ نیشنل ازم کی تشریح و وضاحت کرنے والوں میں ایک اہم نام ارنسٹ گیلنر کا ہے۔ لیکن ماریو بنگے (Mario Bunge) نے جو ارجنٹائن نژاد کینیڈین فلسفی اور سائنس دان ہیں، گیلنر کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے سنٹرل یورپ کے تجربے کو یونیورسل بنا رہا ہے۔ اس کا سوال تھا کہ گیلنر اپنے نظریے کا جنوبی امریکہ پر کس طرح اطلاق کرے گا تو گیلنر کا جواب تھا کہ اس نے اس پر غور نہیں کیا۔

ماریو بنگے اپنی سائنٹفک ٹریننگ کے باعث مختلف تصورات کو ریاضیاتی ایجاز کے ساتھ بیان کرنے کا بہت شوقین ہے۔ نیشنل ازم پر گفتگو کرتے ہوئے پہلے تو اس کی پانچ اقسام گنوائی ہیں: علاقائی، حیاتیاتی (نسلی)، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی۔ پھر ریاضیاتی طریقے کو استعمال کرتے ہوئے ان کے مختلف جوڑے بناتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کی 186 اقسام ہو سکتی ہیں۔ پتہ نہیں دنیا میں اتنی اقوام ہو بھی سکتی ہیں یا نہیں۔

ماریو بنگے کا حوالہ دینے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ہمارے بعض بہت پڑھے لکھے افراد بھی اصرار کرتے ہیں کہ سیاسیات کی کسی نصابی کتاب میں قوم کی تعریف کرتے ہوئے یہ بیان نہیں کیا گیا کہ مذہب کی بنیاد پر بھی قوم بن سکتی ہے۔ مذہبی قوم پرستی کی اصطلاح اب علم سیاسیات کی کتابوں میں جگہ بنا چکی ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے انسانی آبادی کے اختلاط کی بنا پر اکثر مقامات پر محض ایک شناخت کافی ثابت نہیں ہوتی، اس کے ساتھ کچھ اضافہ بھی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں آج بھی ان خوش فہم لوگوں کی کمی نہیں جو کانگرس کے ایک مکمل سیکولر جماعت ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ کانگرس پر جب سے مہاتما گاندھی جی کا غلبہ ہوا تھا اس پر ہندوانہ رنگ غالب آنا شروع ہو گیا تھا۔ مہاتما جی نے اپنی سیاست کے دو بنیادی اصول یہ قرار دیے تھے: رام راج کا قیام اور گوؤ رکھشا۔ بیس کی دہائی میں ہندو مہاسبھا کا قیام عمل میں آیا تھا جو مکمل طور پر فرقہ وارانہ جماعت تھی۔ انتظار حسین صاحب نے اپنی کتاب "اجمل اعظم" میں حکیم اجمل خان کے آخری برسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "جب پنڈت موتی لال نہرو نے مہاسبھائیوں کو ایک لفظ بھی کہنے سے انکار کیا تو حکیم اجمل خان صاحب نے مجبور ہو کر ان سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کوئی

توقع نہ رکھیں۔"

اس بات میں کوئی شک نہیں پنڈت جواہر لال نہرو مکمل طور پر سیکولر تھے لیکن اس بات سے انھیں بھی انکار نہیں تھا کہ کانگرس میں حقیقی اور کمیٹڈ سیکولر افراد بہت چھوٹی سی اقلیت تھے۔ چنانچہ تقسیم ہند کے بھی یہی صورت حال جاری رہی۔ پنڈت جی بااختیار وزیراعظم ہوتے ہوئے سیکولر جمہوریہ ہند کے صدر کو سومناتھ مندر کے افتتاح کی تقریبات میں شرکت کرنے سے نہ روک سکے۔ پنڈت جی کی صاحب زادی نے بڑے فخر سے اعلان کیا تھا کہ ہم نے ہزار سال کی غلامی کا بدلہ لے لیا ہے۔ بابری مسجد کو مسمار کرنے کا واقعہ کانگرس کی حکومت کے دوران میں پیش آیا۔ گزشتہ انتخابات میں بی جے پی کے ارادوں سے باخبر ہونے کے باوجود کانگرس کی قیادت نے اقلیتوں کی طرف رجوع کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

ہندوستان آج جس صورت حال کا شکار ہے اس میں کانگرس کی پالیسیوں کا بھی ہاتھ ہے جس طرح پاکستان میں پیدا ہونے حالات کی ذمہ داری بڑی حد تک مسلم لیگ کی خراب کارکردگی پر عاید ہوتی ہے۔

یہ صرف ہندوستان اور پاکستان کی بات نہیں، تشویش ناک امر یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک اقلیتوں کا مسئلہ خوش اسلوبی سے حل نہیں کر سکے۔ جب غازی مصطفیٰ کمال نے ترکی کو سیکولر ریپبلک بنانے کا اعلان کیا تھا تو اس وقت وہاں غیر مسلم آبادی بیس فیصد سے زیادہ تھی جو اب صرف ایک فیصد رہ گئی ہے۔ مصر میں مردم شماری میں مذہب کو نکال دیا گیا ہے اس لیے درست اعداد و شمار کا ملنا تو مشکل ہے لیکن دیکھنا ہو گا کہ سعد زاغلول پاشا کی دی گئی تمام تر مراعات کے علی الرغم کیا قبطی مسیحیوں کی آبادی مصر میں بڑھی ہے یا کم ہوئی ہے؟ خود بھارت میں بی جے پی کے عروج سے بہت پہلے پڑھے لکھے اور آسودہ حال مسیحیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ملک چھوڑ کر جا چکی تھی۔ کلکتہ میں آرمینیائی لوگوں کے محلے خالی ہو چکے تھے۔ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے اس پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ذاتی طور پر میں نیشنل ازم کے فلسفے کو سراسر غلط سمجھتا ہوں لیکن جدید ریاست کے ساتھ کچھ ایسے مسائل وابستہ ہیں کہ مخلوط آبادی والے ممالک میں فرق و امتیاز پر جنم لینے والے سوالات سے چھٹکارا پانا اس قدر آسان نہیں۔ یہ محض اکیڈیمک معاملہ نہیں۔ جب ریاستی وسائل کی انسانوں کے مابین تقسیم کے معاملات در پیش آئیں گے تو تنگی کی صورت میں یہ مسائل سر اٹھا لیتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ان سے جان چھڑانا ممکن نہیں، لیکن اس کے لیے ایک طویل جدوجہد اور صبر آزما سعی کی ضرورت ہے۔ ان مسائل کا حل ان کے وجود سے انکار کرنے میں نہیں بلکہ ان کو مان کر حل کرنے کی کاوش میں ہے۔

ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ہمیں پہیہ از سر نو ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسی راستے کو اپنانا ہو گا جس پر چل کر مہذب دنیا نے اس مسئلے کو حل کیا ہے۔ وہی راستہ قائداعظم نے اپنی 11 اگست 1947 کی تقریر میں بیان کیا تھا کہ مملکت مذہب، زبان، نسل یا کسی اور بنیاد پر اپنے شہریوں میں فرق و امتیاز نہیں کرے گی۔ سب برابر کے شہری ہوں گے۔ اس تقریر کو اپنے لائحہ عمل کی بنیاد بنا کر ہی تمام پاکستانی شہریوں کو یکساں حقوق کی ضمانت فراہم کر سکتے ہیں۔ (بشکریہ ہم سب۔ 2019/12/28)

سفیر رامہ

پاکستان کرکٹ ٹیم کا ایک یادگار ٹسٹ میچ

1957 کے آخر میں پاکستانی کرکٹ ٹیم نے ویسٹ انڈیز کا پہلا دورہ کیا۔ جہاں دونوں ٹیموں کے درمیان پانچ ٹسٹ میچ کھیلے گئے۔ یہ دورہ کئی اعتبار سے یادگار ثابت ہوا۔ خاص طور پر اس دورے کے پہلے ٹسٹ میچ میں پاکستانی ٹیم نے ایک ایسا غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیا جس کی ٹسٹ کرکٹ کی ساری تاریخ میں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ اس ٹسٹ میچ میں پاکستان نے کئی ریکارڈ قائم کیے۔ یہ کارنامہ ایسے غیر معمولی حالات میں سرانجام دیا گیا کہ شاید اب اسے دہرانا کبھی بھی ممکن نہ ہو۔ 1877 میں ٹسٹ کرکٹ کے آغاز سے لے کر آج تک کسی ٹیم نے یقینی شکست سے بچنے کے لیے ایسی طویل، ناقابل یقین اور شاندار کامیاب جدوجہد نہیں کی جس کا مظاہرہ اپنی دوسری اننگز میں پاکستانی ٹیم اور اس ڈرامے کے مرکزی کردار پاکستان کے مایہ ناز اوپنر بیٹسمین حنیف محمد نے کیا۔

پاکستان کی ٹیم ویسٹ انڈیز کے مقابلے میں ایک نئی اور کم تجربہ کار ٹیم تھی۔ پاکستان کو ٹسٹ کرکٹ کھیلنے والے ملک کا درجہ 1952 میں ملا تھا۔ جب کے ویسٹ انڈیز کی ٹیم 1928 سے ٹسٹ میچ کھیل رہی تھی۔ ویسٹ انڈیز کے اس دورے سے قبل پاکستان نے کُل 18 ٹسٹ میچ کھیلے تھے۔ سوائے 1954 میں انگلینڈ کے پہلے دورے کے دوران چار میچ انگلینڈ میں کھیلنے کے، زیادہ تر میچ پاکستان اور ہندوستان میں کھیلے گئے تھے۔ ان دنوں پاکستان میں اکثر ٹسٹ میچ میٹنگ پر کھیلے جاتے تھے۔ پاکستان ٹیم کو دوسرے ملکوں کی وکٹوں پر کھیلنے کا بہت کم تجربہ تھا۔ اسکے مقابلے میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم کا شمار دنیا کی بہترین ٹسٹ ٹیموں میں ہوتا تھا۔ جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پچھلے دس سال میں ویسٹ انڈیز نے انگلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور انڈیا کی ٹیموں کے خلاف کُل دس ٹسٹ سیریز کھیلے تھے۔ جن میں سے چھ ویسٹ انڈیز نے جیتے (دو
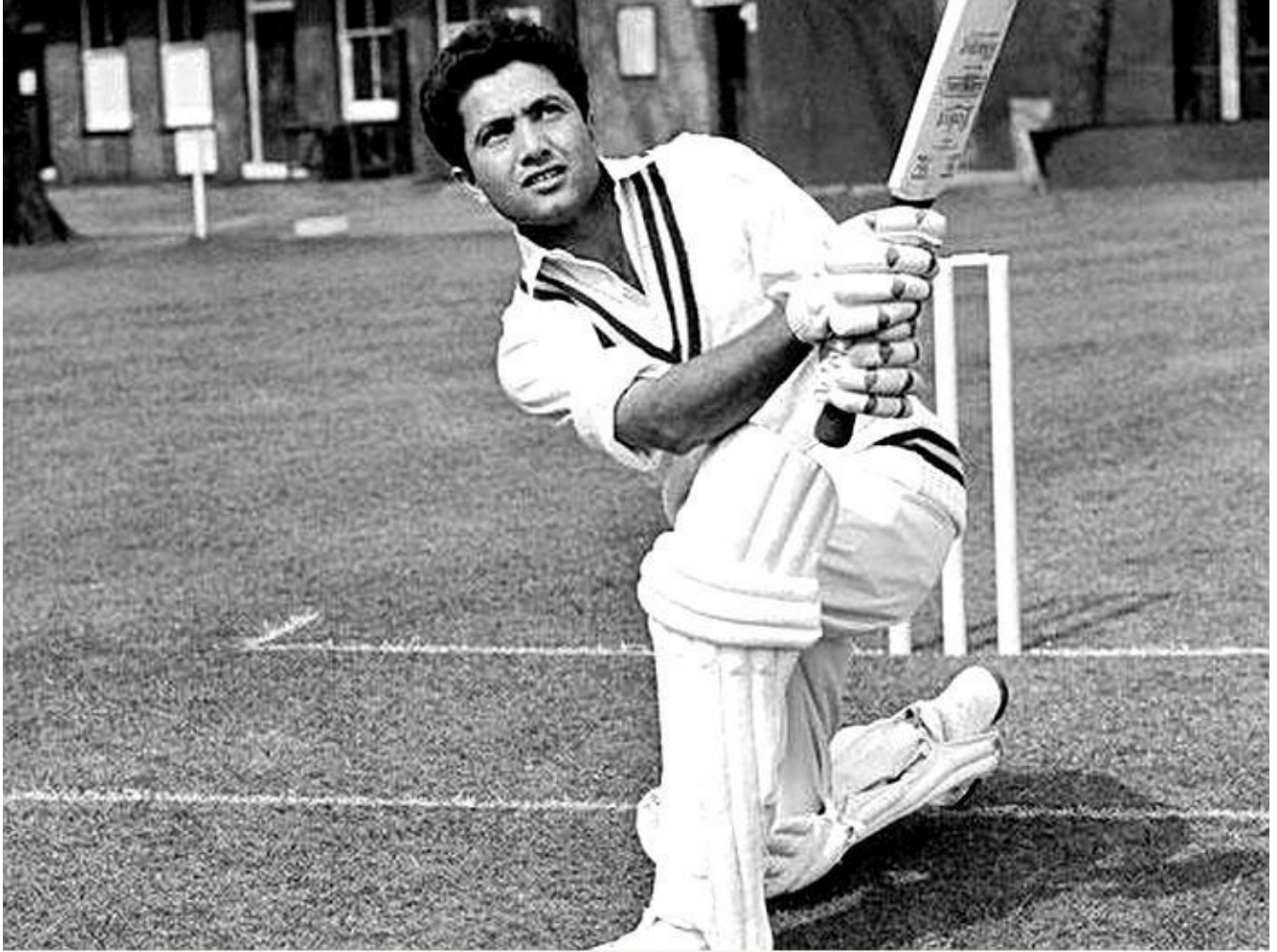
Hanif Muhammad

انگلینڈ، دو نیوزی لینڈ اور دو انڈیا کے خلاف)، تین ہارے (دو آسٹریلیا سے اور ایک انگلینڈ سے) اور ایک سیریز (انگلینڈ سے) برابر رہا۔

ویسٹ انڈیز کے اکثر کھلاڑی بین الاقوامی بہترین شہرت کے مالک تھے۔ اُس زمانے کے ویسٹ انڈیز کے مشہور بلے باز "W's 3" میں سے ایورٹن ویکس (Everton Weekes) اور کلائیڈ والکوٹ (Clyde Walcott) ٹیم میں شامل تھے۔ تیسرے "W" فرینک وورل (Frank Worrrell) انگلستان میں اپنی یونیورسٹی تعلیم کی مصروفیات کی وجہ سے اس سیریز میں نہیں کھیل سکے۔ ایورٹن ویکس اس سیریز سے پہلے لگاتار پانچ ٹسٹ اننگز میں سنچری بنانے کا ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔ چھٹی اننگز میں وہ 90 رنز پر آؤٹ ہوئے تھے۔ اور اسی طرح کلائیڈ والکوٹ لگاتار آٹھ اننگز میں نصف سنچریاں، جن میں چار سنچریاں شامل تھیں، بنانے کا ریکارڈ بنا چکے تھے۔ دونوں کا ٹسٹ کرکٹ کے بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہوتا ہے۔ ایورٹن ویکس کی کیریئر بیٹنگ اوسط 58.61 اور کلائیڈ والکوٹ کی بیٹنگ اوسط 56.68 ہے۔ ٹسٹ کرکٹ کے ایک اور بہترین کھلاڑی گیری سوبرز (Gary Sobers) بھی ویسٹ انڈیز کی ٹیم میں شامل تھے۔ جنہوں نے اس سیریز میں شاندار بیٹنگ کا مظاہرہ کیا اور پاکستان کے خلاف پہلی تین اننگز میں نصف سنچریاں اور اگلی تین اننگز میں سنچریاں بنائیں جن میں تیسرے ٹسٹ میچ میں، جس

Legendry 3 W's: Frank Worrell, Clyde Walcott, Everton Weekes

میں پاکستان کے تین بولرز زخمی تھے، 365 رنز بنا کر ورلڈ ریکارڈ قائم کرنا بھی شامل تھا۔

اُس میچ میں عبدالحفیظ کاردار کے انگوٹھے میں فریکچر تھا۔ محمود حسین کا اپنے پہلے اوور کے پانچویں گیند پر ہیمسٹرنگ hamstring muscle زخمی ہو گیا تھا۔ وہ گراؤنڈ سے باہر چلے گئے اور بقیہ میچ میں حصہ نہ لے سکے۔ اگلی صبح نسیم الغنی کی بھی انگلی فریکچر ہو گئی۔ پاکستان کے پاس صرف دو باؤلر فضل محمود اور خان محمد رہ گئے۔ سوائے وکٹ کیپر امتیاز اور وزیر محمد کے، اس میچ میں پاکستان کے باقی سب کھلاڑیوں کو بولنگ کروانی پڑی۔ ویسٹ انڈیز نے پاکستان کی بولنگ کی کمزوری کا خوب فائدہ اُٹھایا۔ اور ٹسٹ کرکٹ کی تاریخ کا جو تھا سب سے زیادہ ایک اننگز کا سکور 790 رنز بنایا۔ اگر کونریڈ ہنٹ اتفاق سے 260 رنز پر رن آوٹ نہ ہو جاتے تو ممکن تھا اس میچ میں دو ٹرپل سنچریاں بن جاتیں۔

ٹیم کے اوپننگ بیٹسمین دو بہترین کھلاڑی روہن کینہائی (Rohan Kanhai) اور کونریڈ ہنٹ (Conrad Hunte) تھے۔ ٹیم کے کپتان اور وکٹ کیپر گیری الیگزینڈر (Gary Alexander) بھی اچھے بیٹسمین تھے۔ باؤلروں میں آف سپنر کولی سمتھ (Colie Smith) اور میڈیم پیس باؤلنگ کرانے والے ڈینس ایٹکنسن (Denis Atkinson) تھے جو دونوں اچھے بیٹسمین بھی تھے۔ الفریڈ ویلنٹائن (Alfred Valentine) بائیں بازو سے لیگ سپن کروانے والے سپنر تھے۔

ویسٹ انڈیز کے باؤلروں میں سے سب سے خطرناک باؤلر رائے گلکرسٹ (Roy Gilchrist) تھا جو اسوقت دنیا کا سب سے تیز رفتار باؤلر تھا اور 95 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گیند پھینکتا تھا۔ اُسکے بازو غیر معمولی طور پر لمبے تھیء اور اسکے گھٹنوں تک آتے تھے۔ وہ انتہائی غصیلے مزاج کا تھا اور ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ ان دنوں ٹسٹ کرکٹ میں باؤنسر پھینکنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بیٹسمین کی حفاظت کا بھی کوئی خاص بندوبست نہیں تھا۔ نہ ہیلمٹ پہننے کا رواج تھا نہ کہنیوں، رانوں اور چھاتی پر حفاظتی پیڈ لگانے کا۔ بیٹسمین گلکرسٹ کے خطرناک باؤنسر کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ پاکستان ٹیم کے کپتان کاردار کی اپنے کھلاڑیوں کو ہدایت تھی کہ گلکرسٹ کی گیند پر چوکا مارنے کے بعد اسکی طرف نہ دیکھیں۔ ورنہ وہ غصے میں آکر باؤنسر مارنے شروع کر دیگا۔

گلکرسٹ اپنے غصیلے مزاج کی وجہ سے صرف 13 ٹسٹ میچ کھیل سکا۔ اُسی سال جب ویسٹ انڈیز کی ٹیم نے ہندوستان کا دورہ کیا تو نارتھ

زون سے میچ کے دوران گلکرسٹ نے کسی بات پر غصہ کھا کر بیمر (beamer) یعنی سیدھے جسم پر تیز بال مارنے شروع کیے۔ اور کپتان الیگزینڈر کے منع کرنے پر بھی باز نہ آیا۔ کپتان نے اسے گراؤنڈ سے باہر نکال دیا۔ اور اگلے دن واپس ویسٹ انڈیز بھجوا دیا۔ اس واقعہ کے بعد گلکرسٹ کے ٹسٹ میچ کھیلنے پر ہمیشہ کے لیے پابندی لگ گئی۔

Roy Gilchrist

انفرادی طور پر بھی پاکستان کا ویسٹ انڈیز کی ٹیم سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ پاکستانی ٹیم کے کپتان عبد الحفیظ کاردار تھے۔ جو ان تین پاکستانی ٹسٹ کھلاڑیوں میں شامل تھے جو تقسیم سے پہلے کُل ہندوستان کی ٹیم کیطرف سے بھی ٹسٹ میچ کھیل چکے تھے۔ دو ملکوں کی طرف سے ٹسٹ میچ کھیلنے والے دوسرے دو کھلاڑی امیر الٰہی اور گل محمد تھے۔ (امیر الٰہی نے لیگ بریک اسپنر کے طور پر تقسیم سے پہلے ہندوستان کی ٹیم کی ایک ٹسٹ میچ میں اور بعد میں پاکستان ٹیم کی پانچ ٹسٹ میچوں میں نمائندگی کی تھی۔ اسی طرح گُل محمد نے بطور بیٹسمین کُل ہندوستان ٹیم کی آٹھ ٹسٹ میچوں میں اور بعد میں پاکستان ٹیم کی ایک ٹسٹ میچ میں نمائندگی کی تھی)۔ عبد الحفیظ کاردار 1946 میں انگلینڈ کا دورہ کرنے والی کُل ہندوستان کی ٹسٹ ٹیم میں شامل تھے۔ انگلینڈ میں انہوں نے تین ٹسٹ میچ کھیلے تھے۔ 1952 میں جب پاکستان نے اپنا پہلا ٹسٹ سیریز ہندوستان کے خلاف کھیلا تو عبد الحفیظ کاردار پاکستان ٹیم کے پہلے کپتان مقرر ہوئے اور ویسٹ انڈیز کے دورے کے بعد ریٹائر ہونے تک ٹیم کے کپتان رہے۔ بعد میں بھی لمبے عرصے تک پاکستان کرکٹ کی باگ دوڑ کاردار کے ہاتھ میں رہی۔

پاکستان کی ٹیم میں اس وقت تک کے بین الاقوامی شہرت کے مالک ایک ہی کھلاڑی فضل محمود تھے۔ جنہیں میٹنگ کا بادشاہ کہا جاتا تھا۔ وہ ہندوستان، آسٹریلیا، انگلینڈ اور نیوزی لینڈ کے بہترین بلے بازوں کے مقابلے میں اپنی میڈیم فاسٹ بولنگ کا لوہا منوا چکے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں پاکستان ٹیم کے پہلے ہیرو تھے۔ پاکستان کی کرکٹ کے میدان میں ابتدائی کامیابیوں کا سہرا بڑی حد تک فضل محمود کی بولنگ پر تھا۔

مثال کے طور پر پاکستان نے 1952 کے ہندوستان کے دورے کے دوران دوسرے ٹسٹ میچ میں ہندوستان کو ایک اننگز سے شکست دی

تھی۔اس میچ میں فضل محمود نے مجموعی طور پر 12 اور ہندوستان کی دوسری اننگز میں صرف 42 رنز کے عوض 7 وکٹیں لیں۔پاکستانی ٹسٹ ٹیم نے دوسرا ٹسٹ میچ 1954 میں انگلینڈ کے پہلے دورے کے دوران جیتا۔جب اوول کے میدان میں فضل محمود نے اپنی شاندار بولنگ سے انگلینڈ کو شکست سے دوچار کیا۔یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ٹسٹ ٹیم نے اپنے انگلینڈ کے پہلے دورے میں انگلینڈ کو شکست دی تھی۔آسٹریلیا کی ٹیم 1955 میں ایک ٹسٹ میچ کھیلنے کے لیے پاکستان آئی۔یہ ٹسٹ کراچی میں کھیلا گیا۔پہلی اننگز میں آسٹریلیا کی ٹیم صرف 80 رنز پر آؤٹ ہوگئی. دوسری اننگز میں رچی بینوڈ کی نصف سنچری کے علاوہ اس میچ میں کوئی بھی کھلاڑی فضل محمود کے سامنے نہ ٹک سکا۔فضل محمود نے پہلی اننگز میں 6 اور دوسری اننگز میں 7 وکٹیں لیں۔اور پاکستان یہ میچ آسانی سے جیت گیا۔

فضل محمود کا تعلق بھی پاکستان کی ابتدائی کرکٹ ٹیم کے کئی اور کھلاڑیوں کی طرح لاہور سے تھا۔ان دنوں کراچی اور لاہور کرکٹ کے مرکز تھے۔لاہور کے زیادہ تر کھلاڑیوں کی تربیت گورنمنٹ کالج اور اسلامیہ کالج کے آپس کے مقابلوں میں ہوئی تھی۔اس کا اندازہ اسبات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب فضل محمود 1941 میں اسلامیہ کالج کی کرکٹ ٹیم میں شامل ہوئے تو ان کے ساتھ ٹیم میں کھیلنے والے کھلاڑیوں میں نذر محمد، عبدالحفیظ کاردار، مقصود احمد، امتیاز احمد، شجاع الدین اور ذوالفقار احمد تھے۔جن سب نے بعد میں پاکستان ٹسٹ ٹیم کی نمائندگی

Abdul Hafeez Kardar - Fazal Mahmood - Imtiaz Ahmad

کی۔ کالج کے بعد تین سال فرسٹ کلاس کرکٹ میں بہترین کارکردگی دکھانے کے بعد فضل محمود کو 1947 میں آسٹریلیا کے دورے پر جانے والی کُل ہندوستان کی ٹیم میں شامل کیا گیا تھا۔ لیکن ٹیم کی آسٹریلیا روانگی سے چند دن پہلے ہی ہندوستان کی تقسیم ہو گئی۔ فضل محمود نے اس خیال سے کہ اب یہ ٹیم صرف ہندوستان کی نمائندہ ہو گی آسٹریلیا جانے سے انکار کر دیا۔ اور پُونا میں ٹیم کا ٹریننگ کیمپ ختم ہونے پر کپتان لالہ امرناتھ کے اصرار کے باوجود لاہور آ گئے۔

لالہ امرناتھ نے مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے ذریعے مغربی پنجاب کے وزیر اعلیٰ افتخار حسین ممدوٹ کو پیغام بھجوایا کہ وہ فضل محمود کو ٹیم کے ساتھ آسٹریلیا جانے پر راضی کریں۔ لیکن فضل محمود نے افتخار حسین ممدوٹ کی بات بھی یہ کہہ کر نہیں مانی کہ اگر انہوں نے آسٹریلیا میں کوئی کارنامہ سر انجام دیا تو وہ ہندوستان کے کھاتے میں جائے گا۔ جس پر افتخار حسین ممدوٹ نے بھی مزید اصرار نہ کیا۔ بعد میں فضل محمود کا کہنا تھا کہ انہیں اس فیصلے پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ باوجود اسکے کہ انہیں ٹسٹ کرکٹ کھیلنے کے لیے مزید پانچ سال انتظار کرنا پڑا، جب تک پاکستان کو 1952 میں ٹسٹ کرکٹ ٹیم کہ درجہ نہ مل گیا۔ یوں ان کے ٹسٹ کرکٹ کھیلنے کے پانچ بہترین سال ضائع ہو گئے۔ فضل محمود کو صرف اسبات کا افسوس تھا کہ انہیں بریڈمین کو بولنگ کروانے کا موقع نہ مل سکا۔

فضل محمود کے ساتھ دوسرے فاسٹ بولر خان محمد اور محمود الحسن تھے۔ بیٹنگ کا زیادہ انحصار حنیف محمد اور امتیاز احمد پر تھا۔ پاکستان ٹسٹ کرکٹ کے ابتدائی دنوں میں ٹیم کے سب سے بہترین بلے باز حنیف محمد تھے جو ٹیم کے اوپننگ کھلاڑی تھے۔ وہ ایک بہترین سٹروک پلئیر تھے لیکن کپتان کاردار نے ان کی یہ ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ وہ طویل عرصے تک اپنی وکٹ کا دفاع کریں۔ اس ڈیوٹی کو اپنے سارے کیریئر میں انہوں نے خوب اچھے طریق سے نبھایا۔ پاکستان ٹیم کی پہلی نصف سنچری حنیف محمد نے ہندوستان کے خلاف پہلے ٹسٹ میچ میں بنائی تھی۔ اسی دورے کے تیسرے میچ میں وہ 96 سکور پر آؤٹ ہوئے۔ اپنے کیریئر کی پہلی سنچری، 142 رنز، انہوں نے 1955 میں ہندوستان کے جوابی دورے کے تیسرے ٹسٹ میچ میں، جو بہاولپور میں کھیلا گیا تھا، بنائی۔ اسی سال جب نیوزی لینڈ کی ٹیم تین ٹسٹ میچ کھیلنے کے لیے پاکستان آئی تو دوسرے ٹسٹ میچ میں حنیف محمد نے 103 رنز اسکور کیے۔ ویسٹ انڈیز کے دورے سے پہلے حنیف محمد نے یہی دو سنچریاں بنائیں تھی۔

امتیاز احمد بھی ابتدائی دور میں پاکستان ٹیم کا ایک اہم ستون تھے۔ پاکستان کے پہلے تین ٹسٹ میچوں کے علاوہ جن میں حنیف محمد وکٹ کیپر تھے، امتیاز احمد اپنے باقی سارے کرکٹ کیریئر میں ٹیم کے وکٹ کیپر رہے۔ وہ ایک جارحانہ انداز سے کھیلنے والے بلے باز تھے۔ خاص طور تیز بولنگ کے خلاف ہُک شاٹ کھیلنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ پاکستان کو ٹسٹ کرکٹ ٹیم کا درجہ دلوانے میں امتیاز احمد کا نمایاں کردار تھا۔ 1948 میں انگلینڈ اور ہندوستان کو شکست دینے والی ویسٹ انڈیز کی ٹیم نے لاہور میں پاکستان کی ٹیم کے خلاف بھی ایک غیر سرکاری ٹسٹ میچ کھیلا۔ امتیاز احمد نے پاکستان کی پہلی اننگز میں 76 رنز بنائے اور نذر محمد کیساتھ پارٹنر شپ میں 148 رنز بنا کر انٹرنیشنل کرکٹ میں پاکستان کی پہلی سنچری پارٹنر شپ اور دوسری اننگز میں کپتان میاں محمد سعید کے ساتھ پارٹنر شپ میں 205 اسکور کر کے پہلی ڈبل سنچری پارٹنر شپ بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔ دوسری اننگز میں امتیاز احمد کا ذاتی اسکور 131 تھا جو انٹرنیشنل کرکٹ میں پاکستان کی طرف سے پہلی

سنچری تھی۔

1951 میں جواہر لال نہرو نے امتیاز احمد کو مہمان کھلاڑی کے طور پر کامن ویلتھ کی مضبوط ٹیم کے خلاف پرائم منسٹر آل انڈیا ٹیم کی طرف سے کھیلنے کی دعوت دی۔ امتیاز احمد نے پرائم منسٹر آل انڈیا ٹیم کی پہلی اننگز میں 300 ناٹ آوٹ رنز اسکور کیے جو انٹر نیشنل کرکٹ میں ایشیا کے کسی کھلاڑی کی پہلی ٹرپل سنچری تھی۔ ٹسٹ کرکٹ میں امتیاز احمد کی بیٹنگ کے جوہر 1955 میں نیوزی لینڈ کی ٹسٹ ٹیم کے دورے کے دوسرے ٹسٹ میچ میں کُھل کر سامنے آئے۔ جب امتیاز احمد ساتویں نمبر پر کھیلنے کے لیے میدان میں اترے تو نیوزی لینڈ کی پہلی اننگز کے 348 اسکور کے مقابلے میں پاکستان کے 111 رنز پر چھ کھلاڑی آوٹ ہو چکے تھے۔ امتیاز احمد نے وقار حسن کے ساتھ مل کر اپنی شاندار جارہانہ بیٹنگ سے میچ کا پانسہ پلٹ دیا۔ امتیاز احمد اور وقار حسن کی ساتویں وکٹ کی پارٹنر شپ میں 308 رنز بنے۔ جو اسوقت تک کی پاکستان کی سب سے بڑی پارٹنر شپ تھی۔ وقار حسن نے 189 اور امتیاز احمد نے 209 رنز اسکور کیے۔ یہ نہ صرف کسی پاکستانی ٹسٹ کرکٹ کھلاڑی کی بلکہ ٹسٹ کرکٹ کی تاریخ میں کسی وکٹ کیپر کی پہلی ڈبل سنچری تھی۔ اسکے علاوہ یہ آٹھویں نمبر پر کھیلنے والے ٹسٹ کرکٹر کا سب سے زیادہ اسکور اور پہلی ڈبل سنچری تھی۔

ویسٹ انڈیز کے خلاف اس پہلے ٹسٹ میچ میں پاکستان کی ٹیم میں امتیاز احمد اور حنیف محمد کے ساتھ تجربہ کار بلے بازوں میں اوپنر علیم الدین، حنیف محمد کے سب سے بڑے بھائی وزیر محمد، والس میتھائیس اور آل راونڈر عبد الحفیظ کاردار شامل تھے۔ پاکستان ٹیم کے چند اور اچھے بلے باز، جن میں وقار احمد، مقصود احمد اور چند اور کھلاڑی شامل تھے، ویسٹ انڈیز کے دورے سے پہلے ریٹائر ہو چکے تھے۔ ٹیم میں کچھ نئے کھلاڑی بھی شامل تھے جنہوں نے اس سے پہلے ٹسٹ کرکٹ نہیں کھیلی تھی۔ ان میں لاہور کے نوجوان اسٹروک پلئیر سعید احمد جنہوں نے ویسٹ انڈیز کے اس دورے میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا، پشاور یونیورسٹی کے آف سپنر حسیب احسن جو کراچی میں کلب کرکٹ کھیل چکے تھے اور 17 سال سے کچھ کم عمر کے کراچی کے بائیں بازو سے اسپن بولنگ کروانے والے نسیم الغنی شامل تھے۔ یوں پاکستانی ٹیم چند اچھے، کچھ درمیانے درجے کے اور تین نئے ٹسٹ میچ کے کھلاڑیوں پر مشتمل تھی۔

پاکستان اور ویسٹ انڈیز کا پہلا ٹسٹ میچ سولہ جنوری کو بارباڈوس (Barbados) کے شہر برج ٹاؤن (Bridgetown) میں کنسنگٹن اوول (Kisnington Oval) کے میدان میں شروع ہوا۔ اس سیریز کے لیے دونوں ٹیموں کے مابین طے ہُوا تھا کہ ٹسٹ میچ چھ دن کے ہونگے۔ اس میچ میں پہلے دو دن کے کھیل کے بعد تیسرے روز وقفہ تھا اور اسکے بعد اگلے چار روز پھر کھیل تھا۔ موسم کافی گرم تھا۔ اگلے دو تین روز میں گرمی میں اور بھی شدت آگئی۔ وکٹ پر گھاس نہ ہونے کے برابر تھا اور بھاری رولر نے اسمیں دھوپ کی چمک پیدا کر دی تھی۔ ویسٹ انڈیز کے کپتان نے ٹاس جیت کر پہلے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

میچ کا پہلا دن

اوپنرز روہن کینہائی اور کونریڈ ہنٹ نے ویسٹ انڈیز کی پہلی اننگز کا آغاز کیا۔ پاکستان کی طرف سے بولنگ کا آغاز فضل محمود اور

محمود حسین نے کیا۔ روہن کینہائی محتاط انداز سے کھیلتے رہے جبکہ کونریڈ ہنٹ نے جلد ہی سٹروک کھیلنے شروع کر دیے۔ روہن کینہائی جب لنچ کے وقفے کے کچھ دیر بعد 27 رنز بنا کر فضل محمود کی گیند پر آؤٹ ہوئے تو پہلی وکٹ کی پارٹنر شپ میں 122 رنز بن چکے تھے۔ اسکے بعد گیری سوبرز نے کونریڈ ہنٹ کے ساتھ مل کر اسکور 209 رنز تک پہنچا دیا۔ گیری سوبرز نصف سنچری مکمل کر کے محمود حسین کی گیند پر 52 رنز پر آؤٹ ہوئے تو ویکس کھیلنے کے لیے آئے۔ کونریڈ ہنٹ نے اپنی سنچری مکمل کی اور اپنی پہلی ٹسٹ اننگز میں سنچری بنانے کا ریکارڈ بنانے والے کھلاڑیوں میں شامل ہو گئے۔ پہلے دن کے کھیل کے اختتام پر ویسٹ انڈیز نے دو وکٹوں کے نقصان پر 266 رنز بنائے تھے۔ کونریڈ ہنٹ 142 رنز پر کھیل رہے تھے۔ ویکس بہترین فارم میں تھے۔ انہوں نے پہلے دن کا کھیل ختم ہونے تک کونریڈ ہنٹ کے ساتھ 55 رنز کی پارٹنر شپ میں سے تیز رفتاری سے 40 رنز بنائے تھے۔

میچ کا دوسرا دن

کونریڈ ہنٹ میچ کے دوسرے دن کھیل کے آغاز میں ہی اپنے اسکور میں مزید اضافہ کیے بغیر 142 رنز پر، جن میں 17 چوکے شامل تھے، فضل محمود کی گیند پر آؤٹ ہو گئے۔ انکی جگہ کلائیڈ والکوٹ کھیلنے کے لیے آئے۔ ویکس پوری طرح جم کر کھیل رہے تھے اور باؤلروں پر چھائے ہوئے تھے۔ کلائیڈ والکوٹ اور ویکس کی پارٹنر شپ میں 90 رنز بنے۔ جس میں کلائیڈ والکوٹ کا حصہ 43 رنز کا تھا۔ جب کلائیڈ والکوٹ کاردار کی گیند پر آؤٹ ہوئے تو ویسٹ انڈیز کا اسکور 356 تھا۔ انکے آؤٹ ہونے کے بعد کولی سمتھ اور ویکس کی کافی طویل پارٹنر شپ میں 185 رنز بنے۔ کولی سمتھ نے بھی اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا اور 78 رنز بنائے۔ وہ چائے کے وقفے کے بعد علیم الدین کی گیند پر آؤٹ ہوئے۔ دو دن مسلسل باؤلنگ کرنے کے بعد پاکستانی بولر تھک چکے تھے۔ اس لیے علیم الدین کو بھی دو اوور کروانے پڑے جن میں اسے ایک وکٹ مل گئی۔ اسوقت ویسٹ انڈیز کی ٹیم کا اسکور چھ کھلاڑی آؤٹ ہونے پر 551 تھا۔ سوائے ویکس کے سب اچھے بیٹسمین آؤٹ ہو چکے تھے۔ اس لیے اگلی تین وکٹیں جلدی گر گئیں۔ ویکس 197 رنز بنا کر آٹھویں نمبر پر محمود حسین کی گیند پر آؤٹ ہوئے۔ انکی ڈبل سنچری صرف تین رنزوں سے رہ گئی۔ اسکے تھوڑی دیر بعد ویسٹ انڈیز نے نو کھلاڑی آؤٹ ہونے کے بعد 579 رنز پر اپنی اننگز ختم کر دی۔ یہ کسی بھی ٹیم کا اسوقت تک پاکستان کے خلاف سب سے بڑا اسکور تھا۔ اس سے قبل ایک بار انگلینڈ نے ایک میچ میں پاکستان کے خلاف 541 رنز بنائے تھے اور آسانی سے پاکستان کو ایک اننگز سے شکست دے دی تھی۔ ورنہ کبھی کسی اور ٹیم نے پاکستان کے خلاف ایک اننگز میں 400 سے زیادہ رنز نہیں بنائے تھے۔

پاکستان کی پہلی اننگز شروع ہوئی تو دوسرے دن کے کھیل کا بہت کم وقت باقی رہ گیا تھا۔ جس کے دوران حنیف اور امتیاز نے محتاط انداز سے کھیل کر 6 رنز بنائے تھے کہ کھیل کا وقت ختم ہو گیا۔ اگلے دن کھیل کا وقفہ اور کھلاڑیوں کے آرام کرنے کا دن تھا۔

میچ کا تیسرا دن۔ پاکستان کی پہلی اننگز

ایک دن کے وقفے کے بعد جب کھیل دوبارہ شروع ہوا تو حنیف اور امتیاز نے محتاط انداز میں کھیلنا شروع کیا۔ لیکن جلد ہی امتیاز 20 رنز بنا

کر، جو پاکستان کی اِس اننگز میں کسی کھلاڑی کا سب سے زیادہ اسکور تھا، اور حنیف 17 رنز بنا کر آؤٹ ہو گئے۔ ان کے بعد بھی کوئی کھلاڑی ویسٹ انڈیز کے باؤلروں کے سامنے نہ ٹک سکا۔ اور لنچ کے وقفے سے کچھ دیر بعد ساری پاکستانی ٹیم صرف 106 رنز پر ڈھیر ہو گئی۔ رائے گلکرسٹ نے 32 رنز دے کر 4 کھلاڑی آؤٹ کیے اور کُولی اسمتھ نے 23 رنز کے عوض 3 وکٹیں حاصل کیں۔ ویسٹ انڈیز نے فالو آن ڈکلئیر کر کے پاکستان کو دوبارہ کھیلنے کی دعوت دی۔

میچ کا تیسرا اور پاکستان کی دوسری اننگز کا پہلا دن

پاکستان نے اپنی دوسری اننگز شروع کی تو ابھی نصف دن کا کھیل باقی تھا۔ اور یہی خیال کیا جا سکتا تھا کہ پاکستان کی دوسری اننگز کے مکمل ہونے کی رسمی کاروائی باقی ہے ورنہ ویسٹ انڈیز یہ میچ جیت چکی ہے۔ کیونکہ میچ کا ڈرا ہونا ناممکن تھا۔ پاکستان اپنی پہلی اننگز کا اسکور ملا کر ویسٹ انڈیز سے 473 رنز پیچھے تھا اور میچ کے ساڑھے تین دن باقی تھے۔ 473 رنز کی کمی پوری کر کے بھی پاکستان کو مزید اتنا اسکور کرنا تھا اور اتنی دیر تک کھیلنا تھا کہ ویسٹ انڈیز کے پاس میچ جیتنے کے لیے وقت نہ بچے۔ دونوں ٹارگٹ حاصل کرنا ناممکن تھا۔ جن کو حاصل کرنے کے لیے ایک ایسے معجزے کی ضرورت تھی جو ٹسٹ کرکٹ میں کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ پاکستان ٹیم جو اسی دن صبح تین گھنٹوں میں صرف 106 رنز بنا کر آؤٹ ہو چکی تھی، اس سے تو ایسے معجزے کی قطعی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

بعد میں امتیاز کا یہ کہنا تھا کہ وہ اور حنیف محمد جب دوسری اننگز شروع کرنے کے لیے اُس دن دوپہر کو میدان میں اُترے تو انہوں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس میچ میں شکست نہیں کھانی۔ وکٹ کا ایک اینڈ حنیف محمد نے سنبھال لیا اور دوسری طرف سے امتیاز نے اپنے مخصوص جارحانہ انداز میں کھیلنا شروع کیا۔ ان کا اصل مقابلہ رائے گلکرسٹ کے خطرناک باؤنسرز سے تھا۔ جب تک گلکرسٹ کا خوف دور نہ ہو جاتا پاکستانی کھلاڑیوں کا میدان میں زیادہ دیر ٹکنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ امتیاز نے لاہور میں اپنے کلب کرکٹ کے زمانے سے ہی باؤنسر گیند کو ہُک لگانے میں اتنی مہارت حاصل کر رکھی تھی کہ وہ اسوقت دنیا کے سب سے بہترین ہُک شاٹ کھیلنے والے کھلاڑی بن چکے تھے۔ انہوں نے گلکرسٹ کے باؤنسرز کو ہُک کر کے چوکے لگانے شروع کر دیے۔ فضل محمود جو پویلین میں بیٹھ کر میچ دیکھ رہے تھے اُن کا کہنا تھا کہ امتیاز نے اُس دن بہت دلیری سے گلکرسٹ کا مقابلہ کیا۔ جب گلکرسٹ کا ایک تیز باؤنسر امتیاز کی ٹھوڑی کو چھو کر گذرا تو فضل محمود کو فکر ہوئی کہ امتیاز زخمی ہو گئے ہو نگے۔ لیکن امتیاز سر جھٹک کر پھر کھیلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ گلکرسٹ نے اگلے بال پر پھر باؤنسر پھینکا جو امتیاز نے ہُک کر کے باؤنڈری کے پار پہنچا دیا۔ تب جا کر فضل محمود کو تسلی ہوئی۔

حنیف محمد نے بھی ایک دوبار گلکرسٹ کے باؤنسر کو ہُک کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ اوور ختم ہُوا تو والکوٹ نے پاس جا کر انہیں مشورہ دیا کہ وہ گلکرسٹ کو ہُک کرنے کی کوشش نہ کریں ورنہ آؤٹ ہو جائیں گے۔ کیونکہ گلکرسٹ کے گیندوں کی رفتار اُن کے لیے بہت تیز ہے۔ حنیف محمد کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ نصیحت پلے باندھ لی اور گلکرسٹ کے باؤنسرز کو ہُک کرنے کی بجائے ان سے خود کو بچانے کی مشق شروع کر دی اور جلد ہی پیچھے ہٹنے کا ایک ایسا انداز اپنا لیا جو باؤنسرز سے بچنے کے لیے اُن کے بہت کام آیا۔ اپنی حفاظت کے لیے حنیف کے پاس

معمولی پیڈ اور گلوز ہی تھے۔ یا پھر اسکے علاوہ انہوں نے ہوٹل کے کمرے سے چھوٹے تو لیے لے کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال رکھے تھے۔

امتیاز اور حنیف کی پارٹنر شپ اس دن کا کھیل ختم ہونے سے دو تین اوور پہلے تک جاری رہی۔ آخر کار ایمپائر نے گلکرسٹ کی ایک گیند پر امتیاز کو غلط آؤٹ دے دیا۔ حنیف محمد جو دوسرے اینڈ سے دیکھ رہے تھے اُن کا کہنا تھا کہ وہ گیند امتیاز کے قریب پچ سے ٹکرا کر بڑی تیزی سے اوپر اُٹھ رہی تھی اور امتیاز کے پیڈ سے بھی اوپر جا کر لگی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ گیند نے وکٹوں سے کافی اوپر سے گذر جانا تھا۔ لیکن امپائر نے امتیاز کو آؤٹ دے دیا۔ ان دنوں رواج تھا کہ ایمپائر میزبان ٹیم کے ہوتے تھے اور مہمان ٹیموں کو ایمپائرنگ کے معیار پر اکثر شکایت رہتی تھی۔

امتیاز 91 رنز پر آؤٹ ہوئے اور سنچری بنانے سے محروم رہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ امتیاز اکثر اپنے جارحانہ کھیل کی وجہ سے وکٹ گنوا بیٹھتے تھے۔ انگلینڈ کے خلاف اپنی زندگی کے آخری ٹسٹ میچ میں وہ پہلی اننگز میں 49 رنز پر اور دوسری اننگز میں 98 رنز پر صرف اس لیے آؤٹ ہوئے کہ دونوں بار انہوں نے احتیاط کا دامن چھوڑ دیا۔ ورنہ انکا اپنے آخری ٹسٹ میچ میں نصف سنچری اور سنچری بنانے کا ریکارڈ قائم ہو جاتا۔ لیکن اس دن وہ میچ بچانے کے لیے بہت دھیان سے کھیل رہے تھے۔ اور اپنی نہیں بلکہ ایمپائر کی غلطی سے آؤٹ ہوئے تھے۔ پھر بھی اپنے شاندار کھیل سے انہوں نے حنیف کے ساتھ اوپننگ پارٹنر شپ میں 152 رنز بنا کر پاکستان کی دوسری اننگز کی ایک مضبوط بنیاد رکھ دی تھی۔ اور پاکستان ٹیم کے کھلاڑیوں کو دکھا دیا تھا کہ گلکرسٹ اور ویسٹ انڈیز کے دوسرے باؤلروں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ امتیاز کے خیال میں یہ ان کے کرکٹ کیریئر کی سب سے بہترین اننگز تھی۔ کھیل ختم ہوا تو پاکستان کا اسکور ایک کھلاڑی آؤٹ ہونے پر 162 رنز تھا۔ حنیف 61 رنز پر اور علیم الدین 1 رنز پر کھیل رہے تھے۔

میچ کا چوتھا اور پاکستان کی دوسری اننگز کا دوسرا دن

چوتھے دن کا کھیل شروع ہوا تو اس دن شدید گرمی تھی۔ پاکستان کی شکست کا خطرہ جوں کا توں موجود تھا۔ ابھی تین دن کا کھیل باقی تھا۔ جو ویسٹ انڈیز کے لیے پاکستان کی ٹیم کو آؤٹ کرنے کے لیے کافی سے زیادہ وقت تھا۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ پاکستان کی ٹیم تین دن مزید کھیل سکتی تھی۔ کاردار نے حنیف کا زبانی حوصلہ بڑھانے کی بجائے گذشتہ رات اُس کے کمرے میں یہ نوٹ لکھ کر چھوڑ دیا تھا کہ You are our last hope یعنی تُم ہماری آخری اُمید ہو۔

حنیف محمد کو کاردار کی ہدایت تھی کہ زیادہ سے زیادہ گیندیں خود کھیلنے کی کوشش کرے۔ تاکہ دوسرے بیٹسمین کا باؤلروں سے کم سامنا ہو۔ حنیف میں concentration یعنی توجہ مرکوز کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ چوتھے دن کے آغاز سے ہی حنیف نے اپنی مکمل توجہ ہر گیند کو سمجھنے پر مرکوز رکھی اور کوشش کی کہ ذرہ برابر بھی انکی توجہ ادھر اُدھر نہ ہو۔ دوسری طرف سے علیم الدین بھی اپنے دفاعی کھیل سے حنیف کا ساتھ دیتے رہے۔ ویسٹ انڈیز کی ٹیم نے کئی باؤلر آزمائے۔ چائے کے وقفے کے نزدیک جا کر علیم الدین 37 رنز بنا کر سوبرز کی گیند پر آؤٹ ہو گئے۔ حنیف اور علیم الدین کی پارٹنر شپ میں 112 رنز بنے تھے اور پاکستان کا سکور 266 تک پہنچ گیا تھا۔ علیم

الدین کے آؤٹ ہونے پر سعید احمد حنیف کا ساتھ دینے کے لیے آئے۔ اور اُس دن کا کھیل ختم ہونے تک دونوں نے پاکستان کا سکور 339تک پہنچادیا۔ حنیف محمد نے اسدن پورے100 رنز بنائے۔ وہ کھیل ختم ہونے پر161 رنز پر اور سعید احمد26 رنز پر کھیل رہے تھے۔

میچ کا پانچواں اور پاکستان کی دوسری اننگز کا تیسرا دن

اس دن بھی شدید گرمی تھی۔ سورج کی چمک سے حنیف کی آنکھوں کے نیچے سے جِلد اُترنی شروع ہو چکی تھی۔ میچ ہارنے کا امکان اسی طرح موجود تھا۔ وکٹ میں بھی ٹوٹ پھوٹ کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کسی وقت بھی پاکستان کی وکٹیں گر سکتی تھیں۔ گذشتہ رات حنیف کو اپنے کمرے میں کاردار کے ہاتھ سے لکھا ہُوا یہ نوٹ ملا تھا۔ You will have a big name in the world if you will save this match. Concentrate harder.یعنی اگر تُم نے یہ میچ بچالیا تو تُم دنیا میں بڑا نام کماؤ گے۔ پہلے سے بھی زیادہ توجہ سے کھیلو۔

حنیف محمد پورے استقلال اور توجہ سے کھیلتے رہے۔ سعید احمد نے بھی ان کا اچھا ساتھ دیا۔ لنچ تک حنیف کا اسکور186 ہو چکا تھا۔ تماشائیوں کو بھی اندازہ ہونے لگا تھا کہ حنیف کتنے مشکل حالات میں کھیل رہے ہیں۔ انہوں نے بھی ان کا ساتھ دینا اور حوصلہ بڑھانا شروع کر دیا۔ گراؤنڈ کے گرد دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی اور کئی تماشائی باہر درختوں پر چڑھ کر میچ دیکھ رہے تھے۔ اس طریق سے میچ دیکھنے کا ویسٹ انڈیز میں بہت رواج تھا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے تماشائی بھی حنیف کے لیے تالیاں بجارہے تھے۔ لنچ کے ایک گھنٹے بعد سعید احمد 65 رنز بنا کر الیگزینڈر کی گیند پر آؤٹ ہو گئے۔ حنیف اور سعید کی پارٹنرشپ میں154 رنز بنے تھے اور اسوقت پاکستان کا اسکور تین وکٹوں کے نقصان پر418 تھا۔ اب وزیر محمد اپنے چھوٹے بھائی حنیف محمد کا ساتھ دینے کے لیے آئے۔ چائے سے کچھ دیر پہلے حنیف نے اپنی ڈبل سنچری مکمل کی۔ چائے کے وقفے پر انکا سکور216 تھا۔ کھیل ختم ہونے تک دونوں بھائی ابھی کھیل رہے تھے۔ حنیف کا اسکور270 اور وزیر کا31 تھا۔ پاکستان کا کُل سکور3 وکٹوں کے نقصان پر525 ہو چکا تھا۔ اور پاکستان کو52 رنز کی سبقت حاصل ہو چکی تھی۔

میچ کا چھٹا اور پاکستان کی دوسری اننگز کا چوتھا دن

آخری دن جب حنیف اور وزیر نے کھیل کا آغاز کیا تو حنیف کو کھیلتے ہوئے ڈھائی دن ہو چکے تھے۔ ایک اننگز سے شکست ہونے کا خطرہ تو ٹل چکا تھا۔ لیکن ابھی پاکستان کی لیڈ صرف52 رنز کی تھی۔ اور ابھی اسبات کی ضرورت تھی کہ اتنا سکور کیا جائے اور اتنی دیر تک کھیلا جائے کہ ویسٹ انڈیز کے میچ جیتنے کا امکان ختم ہو جائے۔ اس دن کے لیے کاردار نے حنیف کو یہ پیغام دیا تھا You've got to stay till tea time, then we will save the game.یعنی تمہیں آج ضرور چائے کے وقفے تک کھیلنا ہے۔ تب ہی ہم شکست سے بچ سکیں گے۔

حنیف نے پہلے کی طرح مکمل توجہ سے کھیل شروع کیا۔ وہ ہر گیند کو پوری احتیاط سے کھیلتے رہے۔ وزیر لنچ سے کچھ دیر پہلے35 رنز پر آؤٹ ہو گئے۔ حنیف اور وزیر کی پارٹنرشپ میں121 رنز بنے تھے۔ یہ حنیف کی لگاتار چوتھی سنچری پارٹنرشپ تھی۔ اسوقت پاکستان کا اسکور4 وکٹوں پر539 تھا۔ وزیر کے بعد والس میتھائیس کھیلنے کے لیے آئے۔ لنچ کے وقفے پر حنیف کا اسکور297 تھا۔ صبح سے اسوقت تک انہوں نے صرف27 رنز بنائے تھے۔ لنچ سے کچھ عرصے بعد حنیف نے300 اسکور پورے کر لیے۔ یہ30 سال کے بعد ٹسٹ کرکٹ کی پہلی

ٹرپل سنچری تھی۔ اس سے قبل 1938 میں لین ہٹن نے 364 رنز بنا کر آخری ٹرپل سنچری اسکور کی تھی۔ جو کسی بیٹسمین کا ایک اننگز میں سب سے زیادہ اسکور کرنے کا عالمی ریکارڈ تھا۔ حنیف کی ٹرپل سنچری سے پہلے صرف 5 ٹرپل سنچریاں بنائی گئی تھیں۔ جن میں سے 2 ڈان بریڈمین نے بنائی تھیں۔ یوں حنیف ٹرپل سنچری بنانے والے پانچویں کھلاڑی تھے۔

چائے کے وقفے پر حنیف کا اسکور 334 تھا۔ جو ڈان بریڈمین کا سب سے زیادہ سکور تھا۔ چائے کے وقفے کے بعد حنیف نے پہلے ڈان بریڈمین کا 334 کا ریکارڈ توڑا اور اسکے بعد والی ہیمنڈ کا 336 کا ریکارڈ بھی توڑ دیا۔ اب صرف لین ہٹن کا ریکارڈ توڑنا باقی تھا۔ حنیف کے ذہن میں اسوقت لین ہٹن کا ریکارڈ یا اسے توڑنے کا خیال نہیں تھا۔ وہ اب مطمئن ہو گئے تھے کہ شکست کا خدشہ بالآخر ساڑھے تین دن کی جدوجہد کے بعد ختم ہو چکا ہے۔ حنیف کا سکور 337 تھا جب ڈینس ایٹکنسن کی ایک گیند وکٹ کی ٹوٹ پھوٹ سے بنے ایک گڑھے سے ٹکرا کر اور بہت سی گرد اڑا کر حنیف کے بیٹ کو ہینڈل کے قریب چھو کر وکٹ کیپر کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اور حنیف محمد ٹسٹ کرکٹ کی طویل ترین اور تاریخی اننگز کھیل کر آؤٹ ہو گئے۔ بعد میں انکا کہنا تھا کہ اگر انہیں خیال ہوتا کہ لین ہٹن کا 364 کا ریکارڈ صرف 27 رنز دور ہے تو وہ پوری توجہ سے کھیلتے رہتے اور اسکا ریکارڈ توڑنے کی ضرور کوشش کرتے۔ حنیف کے آؤٹ ہونے کے بعد کاردار نے 657 رنز پر پاکستان کی اننگز ڈکلئیر کر دی۔ پاکستان کے آٹھ کھلاڑی آؤٹ ہوئے تھے۔ باقی جو وقت بچا تھا اسمیں بغیر کسی وکٹ کے نقصان پر ویسٹ انڈیز نے 28 رنز بنائے۔ یوں یہ یادگار ٹسٹ میچ ڈرا ہو گیا۔
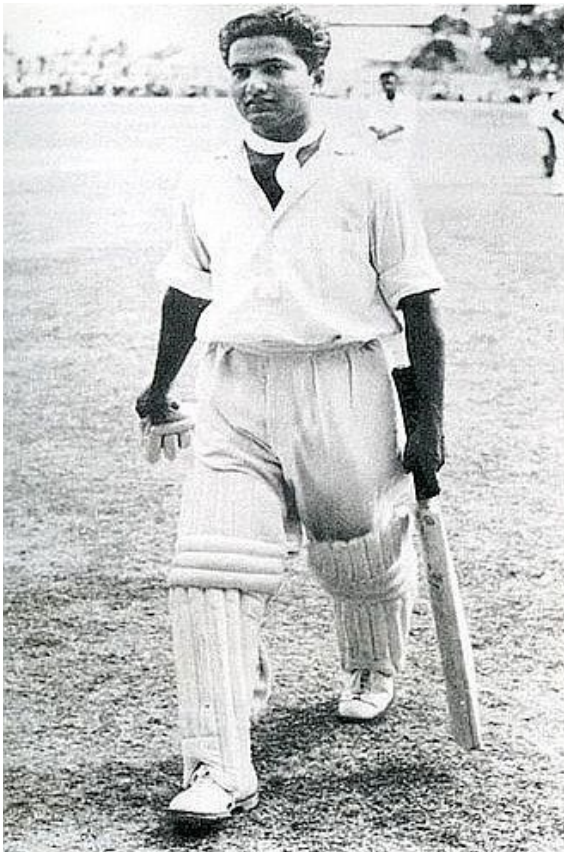
Hanif returning after his epic innings of 337
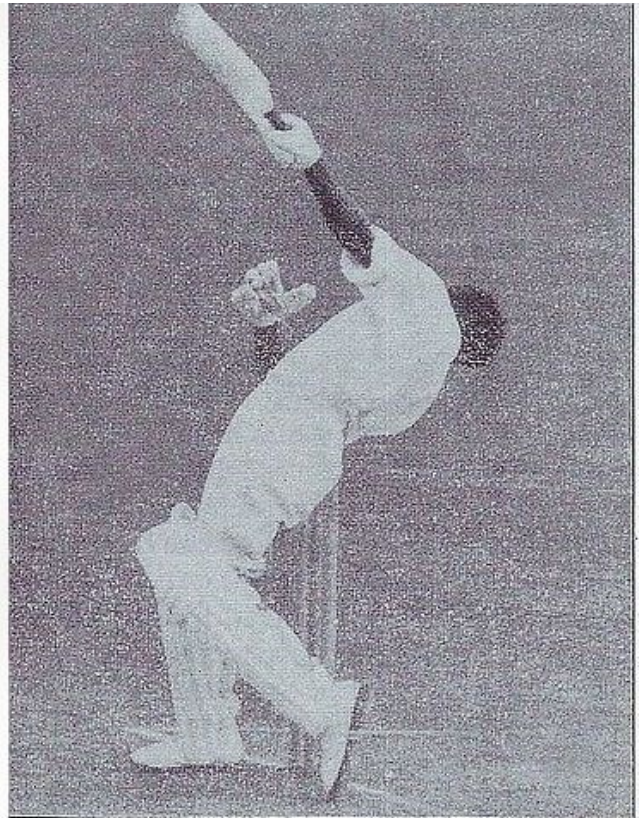
Hanif taking evasive action against Gilchrist's thunderbolts

AN UNFORGETTABLE TEST

SCOREBOARD

TOP HONOURS GO TO PAKISTAN'S HANIF

THIS TEST OF RECORDS BY PAKISTAN

Fighters look good as heavy drills end

Miami U. stars for 6th Open

حنیف محمد کی شکست سے بچنے کے لیے یہ ناقابل یقین طویل اور کامیاب جدوجہد آج بھی ٹسٹ کرکٹ کی بہترین اننگز میں شمار کی جاتی ہے۔ پیٹر روئیبک (Peter Roebuck) نے اسے اپنی کتاب (Great Innings) عظیم ٹسٹ اننگز میں حنیف کی اس اننگز کو ہمت اور ہیروازم کے لیے سب سے زیادہ نمبر دیے۔ وزڈن کی عظیم ٹسٹ اننگز کی رینکنگ میں حنیف کی اس اننگز کو کرکٹ کی تاریخ کی تین بہترین دفاعی اننگز میں شامل کیا گیا ہے۔ کرکٹ کے مشہور نقاد اننتھا نارایانن (Anantha Narayanan) کا کہنا ہے کہ ”بارباڈوس کے اس میچ میں جو ہوا وہ ایک معجزہ تھا۔ ایک عام جسامت کے کھلاڑی نے دفاع کا عزم کر لیا اور وہ سولہ گھنٹے سے زیادہ کھیلتا رہا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ کرکٹ کے میدان میں اس سے بڑی ہمت اور حوصلے کی کوئی مثال دیکھنے میں نہیں آئی“۔

اس یادگار میچ میں بننے والے کچھ ریکارڈ

۱۔ حنیف محمد نے کرکٹ ٹیسٹ میچوں کی طویل ترین 16 گھنٹے 39 منٹ کی اننگز کھیلی۔ یہ ریکارڈ آج تک قائم ہے۔ گو بعد میں ریکارڈ بکس میں اسکا دورانیہ نصف گھنٹہ کم کر دیا گیا۔ لیکن حنیف محمد اس بات پر مصر رہے کہ میچ ختم ہونے پر ان کی اننگز کے وقت کا جو اندازہ لگایا گیا تھا وہی درست تھا۔ ان کے پاس اس بات کے ثبوت بھی تھے۔ بہرحال آدھا گھنٹہ کم کر کے بھی اب اس ریکارڈ کے ٹوٹنے کا بہت کم امکان ہے۔

۲۔ حنیف محمد پہلے کھلاڑی تھے جنہوں نے اپنی ٹیم کی دوسری اننگز میں ٹرپل سنچری بنائی۔ یہ ریکارڈ 56 سال تک اسی طرح قائم رہا۔

حنیف کے بعد نیوزی لینڈ کے برینڈن میکیلن (Brendon McCullen) دوسرے کھلاڑی ہیں جنہوں نے 2014 میں دوسری اننگز میں 302 رنز کی ٹرپل سنچری بنائی۔ حنیف محمد اب بھی دوسری اننگز میں سب سے زیادہ اسکور کرنے والے کھلاڑی ہیں۔

۳۔ حنیف محمد ٹسٹ کرکٹ کے پہلے کھلاڑی ہیں جنہوں نے ایک اننگز میں لگاتار چار سنچری پارٹنرشپ بنائیں، امتیاز کے ساتھ پہلی وکٹ کی شراکت میں 152 رنز، علیم الدین کے ساتھ دوسری وکٹ کی شراکت میں 112 رنز، سعید احمد کے ساتھ تیسری وکٹ کی شراکت میں 154 رنز اور وزیر محمد کے ساتھ چوتھی وکٹ کی شراکت میں 121 رنز۔

۴۔ حنیف محمد کے 337 رنز آج بھی کسی ٹسٹ بیٹسمین کا اپنے ملک سے باہر ایک اننگز میں بنایا ہوا سب سے بڑا اسکور ہے۔

۵۔ پاکستان کی ٹیم کا فالو آن کے بعد دوسری اننگز میں سب سے زیادہ اسکور کرنے کا ریکارڈ آج بھی قائم ہے

۶۔ پاکستان کی پہلی اور دوسری اننگز کے سکور کا فرق 551 رنز کا تھا۔ جو آج بھی ایک ورلڈ ریکارڈ ہے۔

Pakistan Test Team in West Indies 1957-1958

زکریا وِرک

امریکہ میں مسلمانوں کا روز افزوں اثر و رسوخ

زاہد قریشی

لیناخان

رابرٹ صالح

امریکہ کی وفاقی حکومت میں جون 2021 میں ایک مسلمان زاہد قریشی کو فیڈرل جج مقرر کیا گیا ہے۔جج زاہد کی ولادت پاکستانی والدین کے یہاں نیویارک سٹی میں ہوئی تھی۔وہ دو دفعہ عراق میں پراسی کیوٹر کے طور پر متعین رہ چکا ہے جہاں اس کو کیپٹن کا عہدہ دیا گیا تھا۔اسی طرح فیڈرل ٹریڈ کمیشن کا چیئر پرسن لیناخاں (Lina Khan) کو مقرر کیا گیا ہے۔لیناخاں کی ولادت لندن میں پاکستانی والدین کے یہاں ہوئی تھی مگر گیارہ سال کی عمر میں وہ امریکہ ہجرت کر کے آ گئی۔اس تقرری سے قبل لیناخاں کولمبیا یونیورسٹی لاء سکول میں قانون کی پروفیسر تھی۔اسی طرح رابرٹ صالح (ولادت 1979) کو امریکن فٹ بال نیویارک جیٹس ٹیم کا پہلا مسلمان ہیڈ کوچ جنوری 2021 میں مقرر کیا گیا ہے۔صالح نیشنل فٹ بال لیگ NFL کی تاریخ میں پہلا مسلمان کوچ ہے۔صالح اور اس کی بیوی ثناء کے چھ بچے ہیں۔اس کے آباء و اجداد کا تعلق لبنان سے ہے۔

رامی یوسف (ولادت 1991) کامیڈین، ایکٹر اور رائیٹر ہے۔اس کو اس کی فلم "رامی" پر گولڈن گلوب ایوارڈ اور پی باڈی ایوارڈ2020 Golden Globe and a Peabody Award دیا گیا تھا۔

ماہر شالہ علی (Mahershala Ali) پہلا مسلمان ایکٹر ہے جس کو اکیڈمی ایوارڈ اس کی فلموں مون لائٹ اور گرین بک میں اعلیٰ درجہ کی بے مثال ایکٹنگ کی وجہ سے دیا گیا تھا۔

رامی یوسف

ماہر شالہ علی

Keith Ellison

رشیدہ طالب

جمیلہ ناشید

امریکہ کی کانگریس کا پہلا مسلمان کانگریس مین کیتھ ایلی سن (Keith Ellison) تھا جس کا انتخاب 2007 میں ہوُا تھا۔ وہ ڈیٹرائٹ میں 1963 میں پیدا ہوا۔ وہ بارہ سال تک کانگریس کا ممبر رہا اور اس وقت ریاست منی سوٹا کا اٹارنی جنرل ہے۔ اس لحاظ سے وہ ریاست کا پہلا مسلمان اٹارنی جنرل ہے۔

کانگریس کی دو ممبرز رشیدہ حبیب طالب ولادت 1976 اور الحان عمر ہیں۔ رشیدہ کا انتخاب ڈیٹرائٹ کی 31ویں ڈسٹرکٹ سے 2019 میں ہوُا تھا۔ کانگریس کا ممبر منتخب ہونے سے قبل وہ مشی گن ایوان نمائندگان کی ممبر رہ چکی تھی۔ جس وقت رشیدہ کانگریس کی ممبر منتخب ہوئی اس وقت امریکہ کی مختلف ریاستوں کی قانون ساز اسمبلیوں میں دس مسلمان تھے۔ کسی ریاست کی اسمبلی میں سب سے پہلی ممبر جمیلہ ناشید (میسوری) تھی یوں رشیدہ طالب دوسری مسلم خاتون ممبر تھی۔ رشیدہ کا تعلق ڈیموکریٹک پارٹی سے ہے۔ چودہ بہن بھائیوں میں سے وہ سب سے بڑی ہے۔ اس کے آباء واجداد فلسطین سے امریکہ آئے تھے۔ وہ ڈانلڈ ٹرمپ کے عرصہ صدارت کے دوران اس پر کڑی تنقید کیا کرتی تھی اور برملا کہتی تھی کہ ٹرمپ کو impeach کیا جائے۔ وہ اسرائیلی حکومت پر سخت تنقید کرتی ہے اور کہتی ہے کہ امریکہ کو اسرائیل کی امداد بند کر دینی چاہیے۔

جمیلہ ناشید (born b. 1972) کا انتخاب ریاست میسوری سے ہوُا، اور وہ چھ سال تک (2007-2013) اسمبلی کی ممبر رہی تھی۔ اس نے سینٹ لوئیس شہر کے میئر کیلئے الیکشن لڑا مگر خود ہی اپنا نام واپس لے لیا۔ الحان عمر Ilhan Omar (b.1982) کا کانگریس کے لئے انتخاب 2019 میں ہوُا تھا۔ اس سے قبل وہ منی سوٹا ریاست کی ایوان نمائندگان کی تین سال تک نمائندہ رہی تھی۔ الحان پہلی صومالی افریقن عورت ہے جو کانگریس کی ممبر بنی ہے۔ وہ ہمیشہ ٹرمپ کی تنقید کا نشانہ رہی ہے۔

اندرے کارسن Andre Carson دوسرا مسلمان کانگریس مین ہے، پہلا کیتھ ایلی سن تھا۔ اندرے کی ولادت 1974 میں ہوئی اور اس کا انتخاب انڈیانا ریاست سے 2008 میں ہوُا تھا۔ اس کی دادی جولیا کارسن بھی کانگریس کی ممبر رہ چکی تھی۔ کارسن صوفی شاعر رومی کی شاعری، اور میلکم ایکس کی سوانح عمری سے اس قدر متاثر تھا کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اس نے دسمبر 2019 میں ٹرمپ کے خلاف impeachment کے دونوں آرٹیکلز کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

الہان عمر

امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد

امریکہ میں مسلمان یہاں کے لینڈ سکیپ کا جزولاینفک بنتے نظر آرہے ہیں۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سوشل میڈیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ ملک کی ہر ریاست میں مسلمان پبلک اداروں میں نظر آتے ہیں۔ بیس سال قبل جب 11/9 کا واقعہ رونما ہوا تھا اس وقت کی مسلم کمیونٹی اور آج کے دور کی مسلم کمیونٹی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وقت سیاہ فام امریکن مسلمان تعداد میں زیادہ تھے مگر آج کے دور میں امیگرنٹ مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بیس سال قبل امریکہ میں ایک ملین مسلمان تھے مگر آج ان کی تعداد امریکہ میں چار ملین کے قریب ہے۔ اس وقت مسلمان زیادہ تر ری پبلکن پارٹی کو ووٹ دیتے تھے چنانچہ جارج بش نے 2000 میں مسلمانوں کا 72٪ ووٹ حاصل کیا تھا۔ مگر 9/ 11 کے سانحہ بعد 2004 میں اس کی مسلمانوں میں سپورٹ صرف 7٪ رہ گئی اور زیادہ تر مسلمانوں نے جان کیری کو ووٹ دئے تھے۔ سیاہ فام امریکن مسلمانوں کے لئے ان کی شناخت میلکم ایکس اور محمد علی باکسر کا لبرل اسلام تھا۔

ستمبر 2001 کے سانحہ عظیم کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور عداوت پورے شد و مد کے ساتھ سامنے آنے لگی۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں نفاذ شریعت کے خلاف قوانین بنائے جانے لگے۔ 2007 میں 84٪ مسلمانوں نے رائے دی کہ وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے نشانہ ستم بنے ہیں۔ جارج بش اور اوباما کے دور حکومت میں اسلامی ممالک سے امیگریشن زیادہ ہو گئی اور چالیس ہزار مسلمان ہر سال یہاں آئے۔ رفتہ رفتہ مسلمان پبلک لائف میں زیادہ نظر آنے لگے۔ سن 2000 میں امریکہ میں مساجد کی تعداد 1200 تھی جب نمازیں گھروں میں ادا ہوتی تھیں مگر اس وقت امریکہ میں 2769 مساجد ہیں۔ یہ بات دلچسپی کا باعث ہو گی کہ امریکہ میں پہلی مسجد Ross, North Dakota میں شام اور لبنان سے آئے ہوئے مہاجرین نے 1929 میں تعمیر کی تھی۔ مرور زمانہ سے اصل مسجد 1979 میں مسمار ہو گئی تو 2005 میں اسی مقام پر نئی مسجد تعمیر کی گئی۔

آندرے کارسن

ٹیلی ویژن پر مسلمان

علی ویلشی

علی ویلشی Ali Velshi b. 1969 پہلا اسماعیلی مسلمان ہے جس نے کسی کیبل کمپنی MSNBC میں اینکر کے فرائض انجام دئے ہیں۔ وہ کئی سال تک CNN کا بزنس رپورٹر رہا۔ اگرچہ اس کی پیدائش نیروبی میں ہوئی مگر اس نے پرورش ٹورانٹو میں پائی تھی۔ اس کی مادر علمی کوئینز یونیورسٹی کنگسٹن نے اس کو ڈاکٹریٹ

عدنان ورک

کی اعزازی ڈگری دی تھی۔ علی نے نیویارک میں گراؤنڈ زیرو کے قریب مسجد اور کمیونٹی سینٹر کی کھل کر حمایت کی تھی۔ وہ ٹرمپ پر بھی کڑی تنقید کیا کرتا تھا۔ وہ دو پاپولر کتابوں کا مصنف بھی ہے۔

سپورٹس ٹیلی ویژن کے ضمن ایک معروف نام عدنان وِرک ہے جس کی ولادت 1978 میں ٹورنٹو میں پاکستانی والدین کے یہاں ہوئی تھی۔ امریکہ کے مشہور سپورٹس ٹیلی ویژن ESPN میں دس سال سپورٹس اینکر کے بعد اس وقت وہ میجر لیگ بیس بال MLB میں سپورٹس اینکر ہے۔ سپورٹس کے علاوہ وہ movie critic بھی ہے جس کے لئے اس کی پاڈکاسٹ کا نام CINEPHILE with Adnan Virk ہے۔ اس کی فٹ بال کی پاڈکاسٹ کا نام The GM Schuffle ہے۔ ٹیلی ویژن انڈسٹری میں ممتاز اور نامور نام فرید ذکریا کا ہے جو کئی کتابوں کا مصنف، نیوزویک انٹرنیشنل کا ایڈیٹر اور سی این این کے پروگرام جی پی ایس کا ہوسٹ ہے۔ وہ خود کو سیکولر اور غیر عملی مسلمان کہتا ہے۔

حسن منہاج

حسن منہاج (ولادت کیلی فورنیا 1985) کامیڈین، رائیٹر، ٹیلی ویژن ہوسٹ، اور ایکٹر ہے۔ نیٹ فلکس پر اس کی کامیڈی Homecoming King کو دنیا بھر سراہا گیا ہے۔ اس کے والدین نجمی اور سیما علی گڑھ سے امریکہ آئے تھے۔ کامیڈی کے ضمن ایک اور کامیڈین دین عبید اللہ ہے جو کہ پیشہ کے لحاظ سے اٹارنی ہے۔ مگر وکالت کو چھوڑ کر وہ فل ٹائم کامیڈین بن گیا ہے۔ اس کی ولادت لودھی، نیوجرسی میں ہوئی۔ اس کے والد فلسطینی اور والدہ اطالین ہیں۔ وہ ہر دلعزیز پروگرام نیویارک عرب امیریکن کامیڈی فیسٹی ول کا بانی ہے۔ اس کا ایک پروگرام جو امریکہ کے مختلف شہروں میں کیا جاتا Stand Up for Peace ہے جس میں امن کے قیام کیلئے مسلمان اور یہودی ایکٹرز مل کر پرفارم کرتے ہیں۔

عبداللہ حمود

سیاست کے میدان میں

نومبر 2121 میں مشی گن ریاست کے ڈئربارن شہر کے میونسپل انتخابات میں شہر کا پہلا عرب مسلمان میئر چنا گیا ہے۔ 31 سالہ نئے میئر کا نام عبداللہ حمود ہے۔ اس سے پہلے وہ ریاست کی اسمبلی کا ممبر تھا۔ اس کے والدین لبنان سے ہجرت کرکے امریکہ آئے تھے۔ اسی طرح ایک اور شہر Hamtramck کے نئے میئر کا نام عامر غالب ہے۔

ثاقب علی

ثاقب علی میری لینڈ کی ریاست کی اسمبلی میں چار سال تک 2007-2011 ممبر رہا تھا۔ ثاقب کی پیدائش شکاگو میں جنوری 1975 کو ہوئی تھی۔ اس کے والدین کا تعلق ہندوستان اور پاکستان سے ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمارے گھر میں سیاسی موضوعات پر گرما گرم بحث ہوتی تھی مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ میرے رشتہ

داروں میں سے کسی نے کبھی ووٹ نہیں دیا تو میں نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔

ڈاکٹر زہدی جاسر

ڈاکٹر زہدی جاسر Zuhdi Jasser سابق صدر ٹرمپ کا حمایتی ہے۔ زہدی فی نیکس (ایری زونا) میں ڈاکٹر ہے جس کو 2012 میں کمیشن آن ری لجس فریڈم کا ممبر مقرر کیا گیا تھا۔ زہدی کی پیدائش 1967 میں ڈیٹن (اوہایو) میں ہوئی تھی۔ زہدی کو سیاسی اور مذہبی امور پر تجزیہ نگار اور وقیع مبصر ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ وہ امریکہ کی نیوی میں لیفٹننٹ کمانڈر رہ چکا ہے۔ وہ اس بات کا حامی ہے کہ سیاست اور مذہب کو الگ الگ ہونا چاہیئے۔ وہ امریکہ کے بڑے بڑے ٹیلی ویژن سٹیشنوں پر اظہار خیال کر چکا ہے نیز اس کے مضامین ملک کے مقتدر اخباروں کی زینت بن چکے ہیں۔

ہما محمود عابدین Huma Abedin b.1976 ہلری کلنٹن کی 25 سال تک چیف آف سٹاف، سیاسی مشیر اور قابل اعتماد ساتھی رہی ہے۔ اس کے والد سید زین العابدین مرحوم ہندوستان سے تھے اور والدہ صالحہ محمود پاکستان سے ہیں۔ اس نے کئی سال وائٹ ہاؤس میں گزارے اور ہلری کلنٹن کے ساتھ دنیا کے متعدد ممالک کے سفر کئے اور درجنوں وزرائے اعظم اور صدور سے ملاقات کی۔ کچھ روز قبل اس کی کتاب BOTH/AND: A Life in Many Worlds شائع ہوئی ہے۔ ہما عابدین 2016 میں ہلری کلنٹن کی صدارتی الیکشن کی مہم کی چیئر مین تھی۔ 2010 میں اس کی شادی کے موقعہ پر ہلری کلنٹن نے کہا تھا میری ایک بیٹی ہے اگر دوسری بیٹی ہوتی تو وہ ہما ہوتی۔

ہما محمود عابدین

سیاست کے میدان میں صدف جعفر ایک انوکھا نام ہے جو جنوری 2019 میں نیو جرسی کی ریاست میں شہر بلکہ امریکہ میں پہلی خاتون مسلمان میئر منتخب ہوئی تھی۔ صدف جس کی پیدائش شکاگو میں ہوئی تھی اس کی والدہ کا تعلق کراچی (پاکستان) اور والد کا یمن سے ہے۔ بچپن میں وہ ڈپلومیٹ بننا چاہتی تھی جس کیلئے اس نے سٹیٹ ڈی پارٹمنٹ میں انٹرن شب بھی کی تھی۔ مگر مسلمانوں کے خلاف ابھرتی نفرت کے باعث اس نے ہارورڈ میں داخلہ لیا اور ڈاکٹریٹ مکمل کی۔ 2017 میں وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر تھی جب ٹرمپ کا انتخاب صدر امریکہ کے لئے ہوا۔ اس کے نتیجہ میں اس نے سیاست میں جانے کا فیصلہ کیا اور نیو جرسی کی منٹگمری ٹاؤن شپ (آبادی 24,000) کی کونسل کا الیکشن جیت لیا۔ اس کے والدین نے اس کو کہا کہ کیا یہ مناسب نہیں کہ اس وقت ہم پبلک کی نظروں سے دور چھپ کر رہیں؟ مگر اس نے کہا ہمیں اپنے حقوق کی جنگ لڑنی ہے۔ جون 2021 میں اس کو نیو جرسی اسمبلی کیلئے ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے نامزد کیا گیا۔

صدف جعفر

2020 کے الیکشن امریکہ کی 28 ریاستوں میں 170 مسلمان امیدواروں نے حصہ لیا تھا جس میں

ابتہاج محمد

62 کامیاب ہوئے تھے۔ اعداد و شمار کے مطابق دس لاکھ مسلمانوں نے پچھلے سال کے انتخابات میں ووٹ ڈالا تھا۔ ہر امیدوار کو اینٹی اسلام عداوت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ہر ایک کو Islamists or Jihadist کا لیبل لگایا گیا۔

مسلمان اولمپک میڈ لسٹ

نیو جرسی میں رہنے والی چھتیس سالہ ابتہاج محمد Ibtihaj Muhammad امریکہ کی اولمپک میڈ لسٹ ہے۔ وہ پہلی مسلمان کھلاڑی ہے جس نے حجاب پہن کر پہلی بار 2016 کی اولمپک گیمز میں Fencing کے کھیل میں برونز میڈل جیتا تھا۔ ٹائم میگزین نے اس کو 100 Most influential people کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے وہ سپورٹس ایمبسیڈر کے طور خدمات بجالاتی ہے۔ اس کی گارمنٹس کمپنی کا نام Louella ہے۔ یاد رہے کہ ابتہاج سے انسپائر ہو کر پہلی حجابی باربی ڈال بنائی گئی تھی۔ اس کی سوانح عمری کا عنوان Proud ہے۔

اس مضمون میں سیاست، کھیلوں اور ٹیلی ویژن میں اثر و رسوخ والے مسلمانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ورنہ امریکہ میں اس وقت ہزاروں مسلمان سائنسدان، کمپیوٹر ایکسپرٹ، پروفیسر، بنکرز، فلم انڈسٹری میں ایکٹرز، میوزیشن، نغمہ نگار اور بزنس مین (جیسے لاہور کا بلین ائر شاہد خاں) ہیں جو اس ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔

چوہدری نصیر احمد

یادوں کے مزار پر حاضری

ٹی آئی کالج اور فضل عمر ہوسٹل کی چند یاداشتیں

کیا ڈھونڈتے ہو فصل خزاں میں بہار کو

اب وہ چمن کہاں ہے، وہ رنگ چمن کہاں

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے پرانے اساتذہ یا طلباء کالج کے بارے میں تو گاہے بگاہے کچھ لکھتے رہتے ہیں لیکن فضل عمر ہوسٹل کی زندگی کی یادوں پر کسی نے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ یا کم از کم میری نظروں سے تو ایسا مضمون نہیں گزرا۔ میرے خیال میں کالج کے تاریخی ادب کا یہ حصہ ابھی تک تشنہ ہی ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ کالج کے طلباء کی اکثریت ربوہ شہر کی ہی رہنے والی تھی اس لیے ہوسٹل کی اندرونی زندگی اور ماحول سے قدرے آگاہ نہیں تھی۔ مجھے دو سال (1968 -1970) اِس کالج میں بطور طالب علم اور فضل عمر ہوسٹل میں رہنے کا شرف حاصل ہے۔ گزشتہ دس بارہ سالوں سے دماغ میں یہ خیال گردش کرتا رہتا تھا کہ ہوسٹل کی زندگی کی یادوں پر کچھ لکھنا چاہیے لیکن یہ خیال قلم تک نہیں پہنچتا تھا۔ حال ہی میں ٹی آئی کالج کے زمانہ کے ایک ہونہار کلاس فیلو سے پچاس سال بعد اتفاقاً فون پر بات ہوئی تو کچھ پرانی باتوں کے درمیان میں نے یہ تذکرہ بھی کر دیا۔ یہ سنتے ہی موصوف اسقدر متحرک ہوئے کہ اپنے بچپن کی تبلیغی تربیت کی بنا پر یہ پیشکش بھی کر دی کہ

اگر میں اپنی یادوں کو بول کر اور ریکارڈ کر کے انکو روانہ کر دوں تو وہ رضاکارانہ طور پر اسکو سن کر تحریر کر دیں گے اور مجھے کاپی روانہ کر دیں گے، اسطرح میرے قلم کو مدت سے جو رکاوٹ ہے وہ دور ہو جائے گی۔ میرے دیرینہ کلاس فیلو کی اس ترغیب نے میرے پرانے گردشی خیال کو ایسا دھکا دیا کہ میرے قلم کی رکاوٹ کو دور کر دیا۔ آجکل ویسے بھی کرونا وبا کے زمانہ میں باہر کم ہی جانا ہوتا ہے اس لیے یہ خیال بھی آیا کہ اس فارغ وقت کو کسی مصرف میں لایا جائے۔ ممکن ہے میرا یہ مضمون کسی معمولی حد تک کالج کے تاریخی ادب کی یہ تشنگی یا کمی کو پورا کر دے۔

ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ پچاس سال پہلے جب سے فضل عمر ہوسٹل چھوڑا ہے، آج تک کسی سے کبھی بھی ان واقعات کا ذکر نہیں کیا، نہ زبانی نہ تحریری۔ اس لیے یہ باتیں میری یادوں کے مقبرہ سے آج پہلی بار نکل رہی ہیں۔ میرے لیے ذاتی طور پر بھی ان یادوں کے اس مزار پر پہلی بار حاضر ہونا ایک انوکھا، دلچسپ اور دل افزا تجربہ ثابت ہوا ہے۔ اس لیے ان لفظوں میں میری آنکھ اور دل بھی شریک ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ یادیں میرے ذاتی مشاہدات، تجربات اور محسوسات کی حدود تک ہی ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے بیان کو کسی لگی پٹی کے بغیر، ایک ناتجربہ کار نئے طالب علم کی حیثیت سے ہی لکھا جائے تاکہ اُس دور کی یاد اُسی طرح محفوظ ہو جس طرح واقعات ہوئے تھے یا میرے ذاتی مشاہدہ میں آئے۔ مجھے یہ بھی علم ہوا ہے کہ چند پرانے طلباء نے ٹی آئی کالج کے پرانے زمانہ کا طلباء کا رسالہ المنار آجکل دوبارہ آن لائن جاری کیا ہوا ہے جس سے وہ اپنی پرانی یادوں سے محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح جرمنی میں بھی پرانے طلباء نے یادوں کے دریچے کے نام سے یوٹیوب پر ہفتہ وار پروگرام جاری کیا ہوا ہے۔ پڑھنے والوں میں سے اگر اُسی دور کے کسی پرانے طالب علم کی نظر سے یہ مضمون گزرے تو میری خواہش اور انکو درخواست بھی ہے کہ وہ بھی اپنی یادوں کو کھوجتے ہوئے ضرور کچھ لکھیں۔ مشہور شاعر وحشت کلکتوی کے بقول

مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے ہم بیان کرتے، کہیں سے تم بیان کرتے

میٹرک کا امتحان میں نے گورنمنٹ ہائی سکول کھاریاں ضلع گجرات سے پاس کیا اور والدین کی شدید خواہش پر 1968ء میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ایف ایس سی۔ پری انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں انجنیئر بنوں۔ میرے مضامین میں علاوہ اور مضامین کے فزکس، کیمسٹری، حساب، اور شماریات کے کورسز تھے۔ رہایش کیلئے فضل عمر ہوسٹل کا انتخاب کیا گیا۔ میری عمر اسوقت سولہ سال تھی اور میرے لئے یہ سب ایک بالکل نیا تجربہ تھا کیونکہ اس سے پہلے تک میں ہمیشہ والدین کے ساتھ گھر میں رہا۔ دل میں کالج کی زندگی کی کچھ آزادی کی خوشی اور کچھ انجانے خوف کے ملے جلے جذبات تھے۔ کالج میں کل طلباء کی تعداد کا تو علم نہیں لیکن ان دنوں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی اڑھائی سو کے قریب طلباء ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ان میں سے سو کے قریب احمدی تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو کے لگ بھگ احمدی نہ تھے۔ اسی طرح طلباء کی ایک خاصی تعداد چنیوٹ اور ارد گرد کے قریبی قصبوں اور گاؤں سے بھی کالج میں پڑھنے آتی تھی اور

یہ سب طلباء بھی احمدی نہیں تھے۔ اُس زمانہ میں کالج میں کسی کو کسی کے مذہبی فرقہ کا کم ہی پتہ ہوتا تھا۔ سب ہی صرف طالبِ علم تھے۔

ہوسٹل کا عمومی نظام

جس سال میں نے داخلہ لیا اسوقت کالج کے اصل پرنسپل تو مکرم پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب مرحوم تھے لیکن میرے پہلے سال کے دوران مکرم صوفی بشارت الرحمان صاحب مرحوم بطور قائم مقام پرنسپل کام کررہے تھے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ مکرم قاضی صاحب ٹانگ پر چوٹ کے باعث علیل تھے اور چندماہ کی رخصت پر لاہور گئے ہوئے تھے۔ ہوسٹل کے وارڈن مکرم چوہدری محمد علی صاحب مرحوم تھے جو کالج میں فلسفہ پڑھاتے تھے۔ انکے نائب وارڈن مکرم سعید اللہ خان صاحب مرحوم تھے جو کالج میں شماریات کا مضمون پڑھاتے تھے۔ انکا ربوہ میں پولٹری فارم کا ایک بزنس بھی تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے چناب دریا کی طرف جاتے ہوئے ایک پہاڑی پر خلیل پولٹری فارم کا نام بطور اشتہار لکھا ہوتا تھا جو دور سے نظر آتا تھا۔ ہوسٹل کے ایک اور نوجوان نگران مکرم منور شمیم خالد صاحب بھی تھے جو کالج میں پولیٹکل سائنس کا مضمون بھی پڑھاتے تھے۔ اسی طرح بعد میں ایک اور نوجوان مکرم محمد اسلم منگلا صاحب مرحوم، جنھوں نے حال ہی میں ایم اے پاس کیا تھا اور کالج میں اسلامیات پڑھاتے تھے، انکو بھی ہوسٹل کا ایک سپروائیزر مقرر کر دیا گیا تھا۔ طلباء میں سے چار مزید نیم نگران ہوتے تھے جن کو پریفکٹ کہا جاتا تھا۔ انکا کام طلباء کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کرنا ہوتا تھا۔ یہ پریفکٹ عموماً بی اے کی آخری کلاس سے لیے جاتے ہر پریفکٹ ہوسٹل کی ایک ونگ کا انچارج ہوتا۔ انتظامی لحاظ سے یہ نگرانی کا ایک مضبوط نظام تھا۔ رہائش کے لیے ایک تو ہوسٹل کی مین بلڈنگ تھی جسکا ڈیزائن چکور نما تھا۔ اسکے چار ونگ تھے اور ہر ونگ میں دونوں طرف کمرے اور درمیان میں بڑی سی گلی (Hallway) تھی۔ بلڈنگ کے درمیان بڑا کھلا صحن تھا جہاں نماز کے لیے صفیں بچھائیں جاتیں۔ دوسری منزل پر صرف دو کمرے تھے جن میں اکثر غیر ملکی طلباء ہی رہتے تھے۔ غالباً یہ خیال ہو گا کہ جب تعداد بڑھے گی تو دوسری منزل پر زیادہ کمرے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس بلڈنگ کے علاوہ کچھ علیحدہ مکانات تھے جن کو اینکسی (Annexies) کہا جاتا تھا۔ کچھ سینئر طلباء کو جو بی اے کی کلاسوں میں تھے انہیں انیکسی مکانات میں رہنے کی اجازت مل جاتی تھی اسطرح وہ ہوسٹل کے سخت قوائد وضوابط اور نگرانی سے قدرے آزاد ہو جاتے تھے۔ ہوسٹل کی مین بلڈنگ میں نئے آنے والے طلباء رہتے تھے اور انکی نگرانی بھی سخت تھی۔ رہنے کا انتظام کچھ ایسا تھا کہ مین بلڈنگ میں دو قسم کے کمرے تھے۔ ایک وہ جن کو ڈارمیٹری کہا جاتا تھا اور ان میں چار طلباء کمرے کے چار کونوں میں رہتے تھے۔ دوسرے چھوٹے سنگل رہایشی کمرے تھے جن کو عموماً (Cubicle) کیوبکل کہا جاتا تھا وہ چند ہونہار اور منظور نظر بی اے کے طلباء کو ملتے تھے یا پریفکٹ صاحبان کو بھی اپنے عہدہ کے لحاظ سے سنگل کمرہ ملتا تھا۔

ہوسٹل کی عمومی زندگی

کالج اور ہوسٹل کا درمیانی فاصلہ چند قدم ہی تھا اس لیے ہوسٹل میں رہنے والے طلباء، جب کوئی کلاس نہ ہوتی، ہوسٹل کے اپنے کمرہ میں بھی آسکتے تھے لیکن جو طلباء ربوہ شہر کے رہنے والے تھے وہ کالج میں ہی ٹولیوں کی شکل میں گپ شپ لگاتے یا کالج کی ٹک شاپ میں چائے کی

محفل جماتے۔ ہمارا دن کا اکثر وقت تو کالج کی کلاسوں میں گزر جاتا، اسکے بعد ہم لوگ واپس ہوسٹل آکر اپنے کامن روم میں کیرم بورڈ یا ٹیبل ٹینس کھیلتے، یا ویسے ہی ٹولیوں کی شکل میں خوش گپیوں میں کچھ وقت گزارتے۔ بعض پڑھاکو قسم کے طلباء تو اسی وقت اپنی پڑھائی میں لگ جاتے۔ کامن روم میں ایک ریڈیو بھی تھا، جس پر گانے وغیرہ سننے کی تو ممانعت تھی لیکن طلباء لگا لیتے تھے۔ اصل مقصد ریڈیو سے خبریں سننا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ جنرل ایوب خان نے 1968ء میں پہلے جب یہ اعلان کیا کہ وہ اگلے صدارتی الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے اور پھر مارچ 1969ء میں صدارت سے استعفا دیا تو یہ دونوں خبریں میں نے کامن روم کے ریڈیو سے سنی تھیں۔ ہوسٹل میں ڈنر کے بعد مغرب کی باجماعت نماز ہوتی اسکے بعد کچھ فارغ وقت، جو عموماً چہل قدمی یا ٹک شاپ میں چائے پینے میں صرف ہو جاتا۔ اتنے میں عشاء کی نماز کا وقت ہو جاتا اور اسکے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے اور پڑھائی کا کام شروع ہو جاتا تھا۔ اس پڑھائی کے وقت اپنے کمرے کو اندر سے تالا لگانے کی اجازت نہ ہوتی تھی کیونکہ عموماً کوئی نگران پورے ہوسٹل میں چکر بھی لگاتا تھا اور کبھی دروازہ کھول کر بھی دیکھ لیتا کہ کیا طلباء پڑھ رہے ہیں یا خوش گپیوں میں مشغول ہیں۔ عام طور پر تو نگران لوگ اکثر در گزر ہی کرتے تھے۔ البتہ سب سے بڑا خوف وارڈن چوہدری محمد علی صاحب کا ہی ہوتا تھا۔ جب کبھی کوئی چوہدری صاحب کو دیکھ لیتا اُسکی پہلی کوشش یہی ہوتی کہ باقی سب طلباء کو اُنکی آمد کی اطلاع کر دے۔ ہمارے لیے ایک بڑی اچھی بات یہ تھی کہ مکرم چوہدری صاحب ایک خاص قسم کی خوشبو کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب بھی ہوسٹل کا دورہ کرتے پانی کی بالٹی میں خوشبو کی بوتل انڈیل کر نہا کر آتے، یا کم از کم اپنے کپڑوں کو اسی پانی میں ڈبو کر آتے۔ چوہدری صاحب ہوسٹل کے اندر جس گلی میں سے گزر جاتے خوشبوؤں کی لہریں چھوڑ جاتے اسطرح طلباء کو صرف سونگھ کر ہی پتہ چل جاتا کہ وارڈن صاحب بلڈنگ میں موجود ہیں۔ معلوم نہیں کہ آیا خوشبو انکو واقعی پسند تھی یا دانستہ اپنی آمد کا لطیف اعلان تھا۔ بعض طلباء کہتے تھے کہ کستوری کا عطر استعمال کرتے ہیں لیکن مجھے تو اسوقت یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ کیا بلا ہے۔ بہر حال ہمارے لیے تو کستوری جاسوسی نظام کا ایک قابل اعتبار ذریعہ تھا اور سونگھتے ہی اپنے کمروں میں جا کر پڑھائی شروع کر دیتے۔ غالباً امجد اسلام امجد نے یہ شعر چوہدری صاحب پر ہی کہا ہو گا۔

گزرے ہیں ترے بعد بھی کچھ لوگ ادھر سے
لیکن تری خوشبو نہ گئی راہ گزر سے

عشاء کی نماز کی حاضری

ہوسٹل کی زندگی میں سب سے اہم بات عشاء اور فجر کی باجماعت نمازیں تھیں جو سب کے لیے لازمی تھیں۔ احمدی طلباء کی نماز علیحدہ ہوتی اور دوسرے مسلمان طلباء اپنی نماز باجماعت الگ کرواتے۔ ان دونوں نمازوں پر سب کی حاضری لگنی ہوتی تھی، اسطرح انتظامیہ کو پتہ چل جاتا کہ کون ہوسٹل سے غائب ہے۔ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں کی حاضری نہیں ہوتی تھی، جس نے نماز ادا کرنی ہوتی وہ صفوں والی جگہ جا کر نماز ادا کر سکتا تھا۔ گرمیوں میں ہم اکثر چارپائیاں باہر نکال کر کھلے صحن میں بھی سوتے تھے۔ اکثر چوہدری محمد علی صاحب خود بھی

ہوسٹل آکر طلباء کو صبح کی نماز کیلئے اُٹھاتے۔ انکا طریق یہ تھا کہ پائیدان کی طرف کھڑے ہو کر طلباء کے پاؤں دباتے اور آگے نکل جاتے۔ سردیوں میں کوئی نگران کمروں کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹا تا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ چوہدری صاحب کی موجودگی بہر حال نماز پر زیادہ حاضری پیدا کرتی۔ عشاء کی حاضری پہلے سال مکرم منور شمیم خالد صاحب باقاعدہ سب کا نام بول کر رجسٹر میں حاضری لگاتے تھے اور دوسرے سال مکرم محمد اسلم منگلا صاحب نے یہ کام سنبھال لیا۔ جو بھی عشاء کی نماز کے وقت حاضر نہ ہوتا اسکو ایک روپیہ جرمانہ ہوتا۔ فجر کی نماز میں حاضر نہ ہونے کا پچیس پیسے جرمانہ تھا۔ اسطرح اگر دونوں نمازوں میں غیر حاضری ہوتی تو ایک روپیہ پچیس پیسے کا روزانہ کا نقصان تھا۔ جو کسی مناسب وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتے تھے انکو نگران کے پاس جاکر معقول عذر بیان کرنا ہوتا تھا۔ ہر ماہ کے آخر میں غیر حاضر رہنے والوں کے نام جرمانہ والی لسٹ میں شامل کر کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا جاتا، اسطرح سب طلباء کو پتہ چل جاتا کہ کس کو کتنا جرمانہ ہوا۔ ہم لوگ جو ربوہ سے باہر سے پڑھنے آئے تھے انکے لیے نماز نہ پڑھنے کا جرمانہ عجیب سی بات تھی اور بالکل نئی بھی تھی۔ اور پھر اس بات کی بھی تُک نظر نہیں آتی تھی کہ عشاء کی نماز کا جرمانہ ایک روپیہ اور فجر کا صرف پچیس پیسے کیوں ہے جبکہ اُس عمر میں ہمارے لئے صبح کی نماز کیلئے اٹھنا زیادہ بڑا اجہاد تھا۔ کچھ عرصہ رہنے کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ ربوہ میں چونکہ کوئی سینما گھر نہیں تھا اسلئے شہر میں رہنے والے کچھ لڑکے فلم دیکھنے کیلئے چنیوٹ چلے جاتے تھے اور فلم شروع ہونے کا وقت تقریباً عشاء کی نماز کے قریب تھا۔ ربوہ کے ماحول میں سینما دیکھنا ایک گناہ کبیرہ میں داخل تھا اور امور عامہ کا محکمہ اس بات کی سختی سے نگرانی بھی کرتا کہ کون کون سے لڑکے چنیوٹ فلم دیکھنے جاتے ہیں۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہوا کہ چنیوٹ سینما گھر کے باہر بعض اوقات امور عامہ کے کارکن کھڑے ہوتے ہیں جو ربوہ کے لڑکوں کو سینما میں جاتے یا نکلتے دیکھتے تو انکی دفتر میں رپورٹ ہوتی تھی اور پھر کچھ باز پرس یا شاید جرمانہ وغیرہ بھی ہوتا۔ غالباً یہی وجہ فضل عمر ہوسٹل میں عشاء کی نماز میں غیر حاضری پر ایک روپیہ جرمانہ کی بن گئی۔ صبح کی نماز کے وقت غیر حاضری صرف سوئے رہنے کی وجہ سے ہوتی تھی، اسلئے اسکا جرمانہ صرف پچیس پیسے تھا۔ جرمانے کے علاوہ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ جب بھی کوئی کسی وجہ سے لیٹ آتا تو ہوسٹل کا دروازہ بند ہوتا اور اندر آنے کا کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔

کالج کا مشہور عام چوکیدار بابا شادی کالج کی انتظامیہ کا وفادار اور دیرینہ ملازم تھا۔ وہ دن کو تو کالج کی رکھوالی کرتا تھا لیکن رات کو ہوسٹل میں سوتا تھا۔ بنیادی طور پر ان پڑھ، لیکن بہت مستعد اور ہوشیار آدمی تھا۔ اسکو حکم تھا کہ جو بھی ہوسٹل میں رات کو لیٹ آئے اسکی رپورٹ وارڈن صاحب کو کرے۔ اسکو چکمہ دینا اسقدر آسان بھی نہیں تھا۔ اسکا طریق یہ تھا کہ رات کو اپنی چارپائی ہوسٹل کے دروازہ کے اندر تھوڑا فاصلہ رکھ کر اور اپنی چارپائی کے پائیدان اور دروازہ کے درمیان اپنا مضبوط ڈنڈا اپھنسا کر سوتا تھا۔ اگر کوئی باہر سے دروازے کو دھکا دیتا تو اسکی چارپائی زور سے ہل جاتی اور وہ اٹھ جاتا اور لڑکوں کو رجسٹر میں نام لکھنے کا کہتا۔ اسکے بغیر وہ جانے نہیں دیتا تھا۔ اگلے دن رجسٹر وارڈن صاحب کی خدمت میں پیش کیا جاتا اور پھر وارڈن صاحب کے سامنے لیٹ آنے والوں کی پیشی ہوتی۔

یہ نہیں کہ طلباء ہر روز دیر سے آتے تھے۔، لیکن یہ پابندی طبعیت کو بھاری تھی، خاص کر ان تمام طلباء کیلئے جو ربوہ کے ماحول سے باہر

سے آئے تھے۔ عام شہروں میں کہاں ایسے نماز نہ پڑھنے کے جرمانے تھے۔ پابندی خواہ کسی بھی قسم کی ہو، انسان کی آزاد طبیعت اسکو آسانی سے ماننے پر مائل نہیں ہوتی۔ بلا آخر ہم لڑکے بھی حضرت آدم کے پڑپوتے تھے جنہوں نے پابندی نہ ماننے کے بدلے جنت سے نکلنا منظور کر لیا تھا۔ کبھی کبھار ہم بھی دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے چنیوٹ چلے جاتے، یا بعض اوقات ویسے ہی عشاء کی نماز سے غیر حاضر ہوتے، یا کبھی صرف سوئے رہنے کے باعث صبح کی نماز سے بھی غیر حاضری ہو جاتی تھی۔ اسطرح مہینہ کے آخر میں جرمانہ کی لِسٹ میں نام آجاتا اور ہر ماہ دس بارہ روپے کا جرمانہ بن جاتا۔ ہم غریب طلباء جو والدین کے بھیجے ہوئے محدود پیسوں پر پڑھ رہے تھے اُن کیلئے ہر ماہ اتنا جرمانہ دینے کا مطلب یہ بھی تھا کہ ٹک شاپ کے خرچہ کو کم کرنا پڑے گا۔ پہلے چند ماہ تو جرمانہ دیتے رہے کیونکہ کوئی اور طریقہ بچنے کا ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ جو طریقے بعد میں ایجاد کئے انکا ذکر نیچے مضمون میں ہو گا۔ پہلے چند ہماری مشکلات اور واقعات پڑھیے اور لطف اٹھایے۔

ایک دفعہ جب ہم دوست ہوسٹل دیر سے واپس آئے تو دروازہ معمول کے مطابق بند پایا اور کوئی بھی بابا شادی کے رجسٹر میں نام لکھنے پر راضی نہ تھا۔ جاڑے کے دن تھے رات سردی بڑھنے لگی، صبح تک باہر انتظار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک تجویز یہ ہوئی کہ قریبی کسی مسجد میں چلے جاتے ہیں اور رات وہاں گزار لیتے ہیں۔ مختلف مساجد کو دیکھنا شروع کیا تو دار لرحمت محلہ کی مسجد کا دروازہ کھلا دیکھ کر اسکے اندر چلے گئے، لیکن کچھ دیر بعد وہاں بھی سردی نے آن پکڑا۔ کوئی کمبل وغیرہ تو اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔ اب یہ تجویز سوجھی کہ صفوں کو گول لپیٹ کر انکے اندر لیٹا جائے، خیال یہ تھا کہ نمازیوں کے آنے سے پہلے یہاں سے بھاگ کر ہوسٹل میں داخل ہو جائیں گے۔ کرنا ایسا ہوا کہ رات کی خواری، تھکاوٹ، سردی اور صفوں کے کمبل سے گہری نیند آگئی۔ آنکھ اسوقت کھلی جب موذن صاحب مسجد میں آچکے تھے اور لڑکوں کو صفوں میں لپٹا دیکھ کر حیران اور پریشان تھے۔ پہلے اسکے کہ وہ چور چور کی دھوم مچاتے ہم سب وہاں سے اسطرح بھاگے جسطرح واقعی چور بھاگتے ہیں۔ جب ہوسٹل پہنچے تو دروازہ کھل چکا تھا، اور ہم نے فجر کی نماز میں شامل ہو کر حاضری بھی لگوا لی۔ ایک اور دفعہ جب فلم دیکھ کر واپس آئے تو پھر دروازہ بند پایا۔ اِسدفعہ یہ ترکیب سوجھی کہ پانی کی ٹینکی، جو غسل خانوں کی چھت پر تھی، اسکے پائپ پکڑ کر ہوسٹل کی چھت پر چڑھا جا سکتا ہے اور وہاں سے اندرونی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر اپنے کمروں میں جایا جا سکتا ہے۔ پھر ہم سب نے ایسا ہی کیا، گو رات کے اندھیرے میں ٹھنڈے پائپوں کو پکڑ کر اوپر چڑھنا خاصا مشکل اور خطرناک کام تھا۔

ایک لطیفہ یوں ہوا کہ دو لڑکے رات کو دیر سے آئے، بابا شادی نے حسب معمول انکو نام لکھنے کا کہا تو انہوں نے بلا چون و چرا حامی بھر لی۔ اگلے دن جب رجسٹر وارڈن صاحب کی خدمت میں پیش ہوا تو بابا شادی کو پوچھا گیا کہ کیا وہ لڑکوں کو شکل سے پہچانتا بھی ہے کہ نہیں۔ رات کے اندھیرے میں نیند سے اٹھا ہوا بابا کس طرح لڑکوں کو پہچان سکتا تھا۔ اسطرح بابا شادی کی بھی شامت آگئی۔ اب وہ سخت ناراض اور سارا دن جو جی میں آتا لڑکوں کو مغلظات سناتا رہا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ رات لیٹ آنے والے دونوں لڑکوں نے چوہدری محمد علی صاحب اور صوفی بشارت الرحمان صاحب کا نام رجسٹر میں لکھ دیا تھا۔ بابا شادی تو پڑھا لکھا نہ تھا کہ پڑھ لیتا۔ ایکدفعہ اور جب ہم لیٹ آئے تو ایک دوست نے یہ ترکیب بتائی کہ جب واپس آئیں تو اسکے کمرہ کی کھڑکی کو ہاتھ سے کھٹکھٹائیں اور وہ اٹھ کر ہوسٹل کا دروازہ کھول دے گا۔ اسکا کمرہ باہر کی

طرف تھا اور کھڑکی بھی باہر تھی۔ اس سکیم میں یہ خطرہ بھی تھا کہ پہلے ہمارے دوست نے نہایت احتیاط سے اس ڈنڈے کو نکالنا تھا جو بابا شادی اپنی چارپائی اور دروازہ کے درمیان پھنسا کر سوتا تھا۔ بابا شادی نیند کا کچا اور ذرا سی آہٹ سے اٹھ جاتا تھا۔ جب یہ سکیم انتہائی احتیاط اور ہاتھ کی صفائی کے ساتھ کامیاب ہو گئی تو کچھ ماہ یہی طریقہ چلتا رہا۔ ہماری بدقسمتی کہ کچھ عرصہ بعد بابا شادی کو اسکا علم ہو گیا تو اس نے اپنی چارپائی کو دروازے کے ساتھ لگا کر سونا شروع کر دیا اور ڈنڈے کو خود ہی بیچ میں سے نکال دیا۔ یہ سب مشکلات اس وجہ سے تھیں کہ عشاء کی نماز سے غیر حاضری کے جرمانے اور بابا شادی کے رجسٹر سے بچا جا سکے۔

جرمانہ معاف کروانے کا طریقہ

جرمانہ سے بچنے کا ایک غیر قانونی طریقہ یہ بھی تھا کہ ساری رات باہر رہو اور جب فجر کی نماز کے وقت دروازہ کھلے تو اندر داخل ہو کر اپنی صبح والی حاضری لگوا لو۔ اسطرح کبھی ہم یہ بات بھی ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے کہ عشاء کے وقت بھی ہوسٹل میں ہی موجود تھے مگر نماز میں حاضر نہ ہو سکے۔ سینما والے گناہ کے الزام سے تو کم از کم چھٹکارہ مل جاتا، لیکن ہر دفعہ ایسا ممکن نہ تھا۔ جرمانہ معاف کروانے کا قانونی طریقہ یہ تھا کہ وارڈن صاحب کو ایک درخواست دینی ہوتی جس میں کوئی قابل قبول وجہ بیان کرنی ہوتی۔ اگر وارڈن صاحب نے اسکو مان لیا تو وہ جرمانے کو معاف کر دیتے یا کبھی آدھا کر دیتے۔ بعض اوقات تو یہ طریقہ بھی چل جاتا تھا لیکن ہر ماہ تو درخواست نہیں دی جا سکتی تھی کیونکہ بہانے تو محدود تھے اور اس سے عادی مجرم ثابت ہونا بھی ثابت ہوتا تھا۔

ہمارے ایک قریبی دوست تھے جو ہمارے ہی ضلع سے آئے ہوئے تھے۔ انکا نام کبھی جرمانہ کی لسٹ میں نہیں آتا تھا لیکن عشاء یا فجر کی نمازوں کے وہ بھی اتنے پابند نہیں تھے۔ بہت منت سماجت کے بعد انہوں نے کہا کہ جب جرمانہ ہو جائے تو وارڈن صاحب کے نام درخواست لکھ کر انکو دے دیں اور وہ اسکو معاف کروا دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور انہوں نے درخواست پر وارڈن صاحب کے دستخط کروا دیے پھر ہر ماہ درخواست لکھ کر ان کو دے دیتے اور وہ منظوری کے دستخط کروا دیتے۔ ایک دن یہ پتہ چلا کہ موصوف بہت ہی فنکار قسم کے آدمی ہیں۔ انہوں نے بغور مشاہدہ سے یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ چوہدری محمد علی صاحب جرمانہ معاف کروانے والی سب درخواستوں پر اپنے خاص قسم کے چھوٹے دستخط کرتے تھے اور دفتر والوں کو اِس راز کا پتہ تھا۔ ہمارے دوست نے بہت محنت اور مشق کر کے اُسی قسم کے دستخط کرنے کی ایسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ دفتر والوں کو کبھی پتہ ہی نہ چلا کہ آیا وہ دستخط اصلی ہیں یا جعلی۔ اِسی طرح جب کسی نے کبھی اپنے گھر واپس جانا ہوتا تو ہوسٹل سے چند دنوں کی غیر حاضری کی چھٹی لینا ہوتی۔ اِسکا طریق بھی یہی تھا کہ وارڈن صاحب کو درخواست دینا ہوتی اور منظوری کے بعد آپ جا سکتے تھے۔ ہمارے وہی دوست جب چاہتے اور جتنے دن بھی انکو ضرورت ہوتی وہ آرام سے چلے جاتے۔ اِسکا بھی انہوں بہت عمدہ انتظام کیا ہوا تھا۔ اُنکے مشاہدہ میں جب چھٹی کی درخواست وارڈن صاحب کو جاتی تو وہ ہمیشہ اپنے پورے لمبے دستخط سبز رنگ کی سیاہی والے قلم سے کرتے تھے جن کو نقل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ ہمارے موصوف دوست اِسقدر ماہر تھے کہ انہوں نے وہ لمبے دستخط بھی اس مہارت سے پکا لیے کہ جب چاہتے خود ہی درخواست لکھی، خود ہی دستخط کیے اور دفتر میں جمع کروا کر بس میں بیٹھے اور گھر پہنچ گئے۔ ہم دوستوں نے

بھی بہت مشق کی لیکن پھر بھی مہارت نہ حاصل کر سکے۔ بلا آخر کچھ عرصہ اپنے دوست کی ہی خدمات حاصل کرتے رہے۔

حاضری کا رجسٹر

جس عرصہ میں مکرم اسلم منگلا صاحب عشاء کی نماز پر حاضری لگاتے تھے ان کا طریق تھا کہ جو بھی حاضر ہوتا اسکے نام کے آگے پی P لگا دیتے اور جو غیر حاضر ہوتا اسکے نام کے آگے اے A کی بجائے صرف ایک چھوٹا سا نقطہ لگا دیتے تھے۔ اس میں منطق یہ تھی کہ اگر طالب علم بعد میں آجائے یا کوئی معقول وجہ بیان کرے تو اسکو پی P میں آسانی سے تبدیل کیا جاسکے، اسطرح طالب علم جرمانہ سے بچ جائے۔ ہمارے ایک اور دوست تھے جنکا نام جرمانہ وغیرہ کی لسٹ میں کبھی نہ ہوتا۔ جب پوچھو ٹال مٹول کر دیتے۔ جب کچھ دوستی بڑھی تو اصل معمہ حل ہوا۔ ان صاحب نے ایک اور نہایت عمدہ طریقہ ایجاد کیا ہوا تھا۔ وہ صاحب مہینہ کے آخر میں وارڈن کے دفتر پر کڑی نظر رکھتے تھے کہ کسی وقت کمرہ کا دروازہ کھلا ملے اور دفتر خالی بھی ہو تو چپکے سے اندر جا کر اپنے نام کے آگے تمام نقطوں کو پی P میں تبدیل کر دیتے۔ اسطرح وہ موصوف دوست تمام جرمانوں سے بچ جاتے۔ یہ طریقہ ہم دوستوں کو بھی بہت بھلا لگا۔ اس سکیم میں جرمانہ معافی کی کسی درخواست کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس تدبیر پر کچھ غور کے بعد ہم چند دوستوں نے تبدیلی یہ کی کہ ہم چار لڑکے رات کو اس تاک میں رہتے کہ باباشادی کسوقت گہری نیند میں سوتا ہے۔ جونہی پتہ چلتا کہ کچھ خراٹوں کی آواز آنی شروع ہو گئی ہے تو ہم چار دوست اپنی ڈیوٹی سنبھال لیتے۔ ایک دروازہ کے باہر، دو گلی کے جاسوس، اور چوتھے آرام سے باباشادی کے سرہانے کے نیچے سے نہایت احتیاط اور ہاتھ کی صفائی سے چابیاں نکال کر دفتر سے حاضری کا رجسٹر نکال کر اپنے کمرہ میں لے آتے اور پھر بڑے تحمل اور اعتماد کے ساتھ چاروں دوستوں کے ناموں کے آگے تمام نقطوں کو پی P میں تبدیل کر کے اسی احیتاط اور رازداری سے رجسٹر واپس دفتر میں رکھ آتے۔ اسطریقہ سے کئی ماہ تک کوئی جرمانہ نہ ہوا۔

ہوسٹل میں منگل کا پلاؤ

ہوسٹل میں کھانے کا انتظام نہایت عمدہ تھا۔ طلباء پر مشتمل ایک میس کمیٹی تھی جو اس بات کا ہفتہ وار فیصلہ کرتی کہ کس دن کیا پکنا ہے اور پھر نوٹس بورڈ پر پورے ہفتہ کا پروگرام لگا دیا جاتا۔ اسطرح سب کو معلوم ہوتا کہ آج کھانے میں کیا ملے گا۔ صبح ناشتہ کی تو کوئی خاص بات اب ذہن میں نہیں رہی کیونکہ میں اکثر صبح کا ناشتہ کالج کی ٹک شاپ میں کیا کرتا تھا۔ ایک یا دو فرائی کئے ہوئے انڈے، ساتھ جمال بیکری کا بہت لذیز بن، اور چائے کا کپ، ابھی تک اسکا خاص مزا یاد آتا ہے۔ ہوسٹل میں لنچ میں تو اکثر دال چاول ہی ہوتے سوائے منگل کے دن، لیکن ڈنر پر ہر دن کوئی مختلف ترکاری، آلو گوشت، مرغی کا قورمہ، بیف کباب اور کبھی پلاؤ بھی ملتا۔ لنچ کیلئے ہمارے میس کا ہال بارہ بجے کھل جاتا تھا اور کوئی دو گھنٹہ تک لنچ کا وقت رہتا تھا۔ اسی طرح شام کے کھانے کے لیے بھی مغرب کی نماز سے پہلے میس ہال کا دروازہ کھل جاتا جو عشاء کی نماز تک کھلا رہتا۔

یہ جو میں نے ابھی منگل کے دن لنچ کی بات کی ہے اسکا میری مستقبل کی پڑھائی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ پڑھیں اور لطف اُٹھائیں کہ کس طرح بظاہر معمولی، بے ضرر اور معصوم سے واقعات انسانوں کی زندگیوں پر کیسے گہرے اور نمایاں اثر ڈالتے ہیں۔ جیسے میں نے کہا ہے کہ لنچ کے لیے میس ہال کا دروازہ پورے بارہ بجے کھل جاتا تھا۔ منگل کے روز ہمیں بڑا لذیز گوشت پلاؤ اور ساتھ آلو کی ٹکیاں اور دہی کا رایتہ لنچ میں ملتا تھا۔ اسقدر مزے دار کہ پچاس سال بعد بھی جب یاد آتا ہے تو منہ میں پانی آتا ہے۔ اس نوجوانی کی عمر میں ہاضمہ تیز ہونے کے باعث بھوک بھی بہت لگتی تھی۔ سب ہی لڑکے منگل کے دن کا انتظار کرتے اور میس ہال کھلنے سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی وہاں لمبی لائن لگ جاتی۔ میری بدقسمتی سے اسی وقت ہماری کیمسٹری کی کلاس شروع ہوتی تھی۔ اگر کلاس ختم ہونے کے بعد کھانے جاتے تو پلاؤ ختم یا ٹکیاں ختم، یا بچا کھچا ملتا تھا یا ویسے ہی کھانا ختم ہو جاتا۔ بھوک اور پلاؤ کے چسکے نے بڑی مشکل پیدا کر دی کہ کیمسٹری کی کلاس میں جایا جائے یا پلاؤ کھانے جایا جائے۔ بلا آخر اس جنگ میں پیٹ کی فتح ہوئی اور ہر منگل کو کیمسٹری کی کلاس میں غیر حاضری ہوتی رہی اور میں میس کی لائن میں چند پہلے طلباء میں ہوتا۔ ہمارے کیمسٹری پڑھانے والے پہلے استاد مکرم رفیق ثاقب صاحب تھے جو ڈسپلن اور حاضری کے بہت پابند تھے مگر انکے افریقہ جانے کے بعد انکے بھائی مکرم پروفیسر مبارک احمد انصاری صاحب نے کلاس لینا شروع کر دی۔ مکرم انصاری صاحب طلباء کے ساتھ بہت نرمی کا سلوک کرتے تھے اور غیر حاضری پر زیادہ پوچھ گچھ بھی نہیں کرتے تھے۔ میرے لئے پلاؤ کھانا اور بھی آسان ہو گیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کیمسٹری کے مضمون میں کمزور ہوتا گیا اور پھر گیارھویں کلاس کے سالانہ امتحان میں اس مضمون میں فیل ہو گیا۔

میرے والد صاحب نے مکرم چوہدری حمید اللہ صاحب کو میرا ذاتی نگران بنایا ہوا تھا۔ جب بھی کبھی کوئی مسئلہ ہوتا میں انکے پاس چلا جاتا۔ کیمسٹری میں فیل ہونے پر مکرم چوہدری حمید اللہ صاحب نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور پوچھ گچھ بھی کی۔ پھر کہنے لگے کہ صرف ایک مضمون میں کمزور ہوں، اگر میں توجہ دوں اور محنت کروں تو کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ غالباً انکی سفارش پر ہی کالج نے مجھے بارھویں کلاس میں داخلہ دے دیا۔ چوہدری صاحب یا کالج والوں کو کیا علم تھا کہ میں پلاؤ اور کیمسٹری کی کس مشکل جنگ میں مبتلا تھا۔ اگلے سال بھی یہی سلسلہ چلتا رہا اور یہ حالت ہو گئی کہ کیمسٹری کے مضمون سے مجھے نفرت سی ہونے لگی بلکہ اسکی کتاب پکڑتے ہی ہاتھ ٹھنڈے ہونے شروع ہو جاتے۔ جب آدھا سال دوسرا ابھی اسی طرح گزر گیا تو اب مجھے خود فکر ہونے لگی کہ میں تو ایف ایس سی کے فائنل امتحان میں کبھی پاس نہ ہو سکوں گا۔ یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اگر ایف ایس سی میں ہی فیل ہو گیا تو پھر آگے پڑھائی کا تمام سلسلہ ہی ختم ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ایف ایس سی کی بجائے ایف اے کا امتحان دے دیا جائے۔ کالج والوں سے کہہ کر مضمون تبدیل تو کر لیے مگر اس بات کا پتہ نہ تھا کہ سرگودھا بورڈ کے فائنل امتحان کیلئے داخلہ کی آخری تاریخ تو گزر چکی تھی۔ کالج کے دفتر والے کہنے لگے کہ ایف اے کا داخلہ اب اگلے سال ہی ممکن ہے، ایک سال مزید کالج میں رہنا پڑے گا۔ مجھے یہ صورت حال منظور نہ تھی۔ ادھر اُدھر سے معلوم ہوا کہ بطور پرائیویٹ طالب علم کے بورڈ کے امتحان کی درخواست دی جا سکتی ہے۔ اسکا مطلب یہ تھا کہ بورڈ کے ریکارڈ میں میں ٹی آئی کالج کا سٹوڈنٹ نہیں ہوں۔ یہ ایک بڑا فیصلہ تھا خاص کر میرے والد صاحب کیلیے جنھوں نے مجھے انجنیئر بنانے کی خاطر اس خاص کالج میں تعلیم کے لیے گھر

سے دور بھیجا اور دو سال ہوسٹل کا خرچہ بھی دیتے رہے۔ لیکن میرے لیے تو مسئلہ یہ تھا کہ ایف اے نہ کیا تو پڑھائی ختم۔ بہر حال میں نے پرائیویٹ ایف اے کا داخلہ بھجوا دیا اور کالج کی تمام کلاسوں میں جانا بند کر دیا۔ میرے پاس صرف چار یا پانچ ماہ تھے جس میں میں نے ایف اے کے دو سال کے کورسز کے تمام نئے مضامین کو پڑھ کر امتحان کی تیاری کرنا تھی۔ اسکا طریقہ ایسے کیا کہ ہوسٹل میں اپنے روم میٹ کو کہتا کہ ناشتہ کے بعد کالج جاتے ہوئے کمرہ کے دروازہ کو باہر سے تالا لگا کر چلا جائے اور لنچ کے وقت آ کر کھولے۔ اور پھر لنچ کے بعد بھی دوبارہ تالا لگا کر چلا جائے۔ اسطرح میرے باہر جانے کا راستہ ہی بند ہو جاتا۔ تقریباً چار، پانچ ماہ تک یہی روٹین رہی اور میرے پاس پڑھنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ ایف اے کی دو سال کی سب کتابیں شروع سے آخر تک دوبار پڑھ ڈالیں۔ امتحان کے لیے میں نے ٹی آئی کالج کو ہی سنٹر بنانے کی درخواست دی تھی اسطرح باقی تمام دوستوں کو بھی پتہ نہ چلا کہ میں پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے تیاری کر رہا تھا اور ان کے ساتھ ہی امتحان میں شرکت بھی کی۔ ایف اے کا امتحان دے کر ہوسٹل میں اپنی دو سالہ رہایش ختم کر کے واپس گھر چلا گیا اور رزلٹ کا انتظار کرنے لگا۔ مکرم والد صاحب نے امتحان اور مضمونوں کے بارہ میں پوچھا کہ فزکس، کیمسٹری اور حساب کے پرچے کیسے ہوئے۔ اب مشکل یہ تھی کہ میں جو کر آیا تھا ان سے چھپایا تو نہیں جا سکتا تھا۔ انہیں بتا دیا کہ میں نے سائنس کے مضامین چھوڑ کر ایف اے کا امتحان دے آیا ہوں۔ پلاؤ والی بات چھوڑ کر ان کو اتنا ہی بتایا کہ کیمسٹری نہیں آتی تھی اسلیے مضامین تبدیل کر لیے تھے اور یہ بھی بتا دیا کہ بطور پرائیویٹ طالب علم کے امتحان دیا ہے۔ ان کو صدمہ تو ضرور ہوا مگر کر بھی کیا سکتے تھے۔ کہنے لگے کہ اگر تو تم پاس ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ تم کچھ کام کر سکتے ہو اور بی اے میں داخلہ دلوا دوں گا۔ اگر فیل ہو گئے تو تمہاری پڑھائی ختم، کوئی اور کام کر لینا۔ گرمیوں کی چھٹیاں اسی انتظار اور کشمکش میں گزر گئیں۔ جب نتیجہ آیا تو میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا، اور بی اے میں کھاریاں کنٹونمنٹ بورڈ ڈگری کالج میں داخلہ مل گیا، اور پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور اور کینیڈا کی ایک بڑی یونیورسٹی سے بھی انتظامیات میں دو ایم اے کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ بظاہر فضل عمر ہوسٹل میں منگل کے دن لنچ پر پلاؤ ایک معمولی اور معصوم سا واقعہ لگتا ہے لیکن میری پڑھائی کی ٹرین نے اسی سے اپنی پٹری کا کانٹا بدلا۔ مجھے کبھی بھی اس کا افسوس نہ ہوا کہ پلاؤ نے مجھے انجینئر نہ بنے دیا۔ آج بھی اپنے گھر میں جب گوشت پلاؤ بنے تو میں آلو کی ٹکیاں بھی بنواتا ہوں اور فضل عمر ہوسٹل میں قیام کے دن یاد آتے ہیں، لیکن وہ اصلی مزا کہاں؟ یہ بھی درست ہے کہ قسمت کا لکھا کون بدل سکتا ہے۔ گو میں نے انجینئرنگ کی باقاعدہ تعلیم تو نہ حاصل کی لیکن بعد کی عملی زندگی کا زیادہ حصہ انجینئرنگ، بلڈنگ ڈیزائین اور تعمیری کاموں میں ہی گزارا۔

فضل عمر ہوسٹل کے کچن سے متعلقہ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ باورچی کی امداد اور کھانا پکانے کیلئے پانچ سات ملازم بھی ہوتے تھے۔ انہوں نے ایک سائیڈ بزنس یہ بھی شروع کیا ہوا تھا کہ کچھ ماہانہ معاوضہ، غالباً دس بارہ روپے، کے بدلے وہ ملازم اپنے طلباء صاحبوں کے بستر بناتے، کپڑے دھوبی کو دیتے اور واپس کمرہ میں لاتے، جوتیاں بھی پالش کرتے، اور جب طالبعلم صاحب بہادر کھانے کیلئے میس ہال میں داخل ہوتے تو وہ ملازم اپنے صاحب کا خاص خیال رکھتے، مثلاً، پلیٹ میں تھوڑا سا زیادہ کھانا، بوٹی بھی عمدہ قسم کی، اور بعض اوقات اگر کھانا موجود ہوتا تو دوسری پلیٹ بھی لے آتے۔ ایک اضافی فائدہ یہ بھی تھا کہ بعض زمیندار گھرانوں کے طلباء جو دیسی گھی میں پلے ہوئے

تھے وہ اپنے گھروں سے ڈبوں میں دیسی گھی لے آتے اور اپنے ملازم کو رکھنے کے لیے دے دیتے۔ جب بھی دال پکتی تو وہ ملازم ڈبہ سے دیسی گھی نکال خوب تڑکا لگا کر اپنے صاحب کے لیے لاتے۔ ہر ملازم کے پاس اسکے کمرہ میں کئی کئی ڈبے دیسی گھی کے پڑے ہوتے اور ان پر مالک کا نام بھی لکھا ہوتا۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ ملازموں کی اپنی صحت بہت اچھی ہو گئی کیونکہ اسکا حساب تو بہت مشکل تھا کہ کس کے ڈبہ میں سے کتنا گھی کس کے لیے نکلا ہے۔ ہم بھی چونکہ گھی گھر سے ہی لاتے تھے اس لیے کبھی حساب بھی نہ پوچھا کہ گھی اتنی جلدی کیسے ختم ہو گیا ہے۔ مجھے ابھی بھی یاد ہے میرے ملازم کا نام شریف تھا اور وہ مہینوں میں پہلوان نظر آنے لگا۔

کرایہ کے پنکھے اور رامپوری ٹوپی

ایک اور بات ان دنوں کی یاد آتی ہے وہ یہ کہ سخت گرمیوں میں گول بازار میں مجید آئرن سٹور سے پنکھے کرایہ پر لینا ہوتا تھا۔ کوئی پانچ سات روپیہ ماہانہ پر پنکھے مل جاتے تھے۔ گرمی اسقدر ہوتی کہ پنکھے چل چل کر خود بھی گرم ہو جاتے اور کچھ دیر کیلئے آرام کرتے اور پھر خود ہی چالو ہو جاتے۔ ہمارے کچھ دوست ایسے بھی تھے جو پنکھوں کی موٹر کو ٹھنڈا کرنے کیلئے ان پر پانی انڈیل دیتے اسطرح موٹر کو جلا کر واپس سٹور والوں کو دے آتے اور نیا پنکھا لے آتے۔ کئی دفعہ ہم نے ایسا بھی کیا کہ دروازہ کے نیچے کمبل وغیرہ سے درمیانی جگہ کو بند کر کے فرش پر پانی کی بالٹیاں انڈیل کر ایک جھیل سی بنا دیتے۔ اسطرح پنکھے کی ہوا کچھ دیر کیلئے قدرے ٹھنڈی رہتی۔ ایک دفعہ مجھے مغرب کی طرف کمرہ ملا جہاں دوپہر کے بعد سورج کی شعائیں کمرے کو اسقدر گرم کر دیتیں کہ کمرے میں رہنا مشکل ہو جاتا۔ میرے روم میٹ نے کھڑکی پر اپنی رضائی بطور پردہ کے لٹکا دی اور ہر دس منٹ بعد رضائی پر پوری بالٹی پانی کی پھینک دیتا، مگر رضائی پھر بھی منٹوں میں سوکھ جاتی۔

پاکستان میں ٹی آئی کالج وہ واحد تعلیمی ادارہ تھا جہاں کالا گاؤن اور ٹوپی پہننی یونیفارم کا لازمی حصہ تھا۔ سردیوں میں تو کپڑوں کے اوپر گاؤن پہنا جا سکتا تھا لیکن ربوہ کی گرمیوں میں کالے رنگ کا لبادہ جسم کیلئے آرام دہ لباس نہ تھا۔ اکثر لڑکے عموماً اسکو کندھے پر ہی لٹکائے رکھتے تھے۔ ٹوپی کے لیے گول بازار میں افضل برادرز کی ایک دوکان تھی جو کالے رنگ کی مخمل کی بنی ہوئی سستی ٹوپیاں فروخت کرتے تھے جس کو رامپوری ٹوپی کہا جاتا تھا۔ جب اس ٹوپی کو خریدا جاتا اسوقت تو مائع لگی ہوئی بہت خوبصورت لگتی لیکن چند ہفتوں میں اسکی سب آکڑ ختم ہو جاتی اور شکل میں بھی گیند نما گول ہو جاتی تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ اکثر لڑکے اسکو سر پر پہننے کی بجائے گول مٹول کر کے جیبوں میں ڈال لیتے تھے اور حسب ضرورت نکال کر سر پر ڈال لیتے۔ ٹوپی کا اکثر گم ہو جانا بھی عام تھا اس لیے گول بازار سے پھر نئی خرید لیتے۔ افضل برادرز کا ٹوپیوں کا کاروبار بہت چلتا تھا۔ مکرم صوفی بشارت الرحمان صاحب کے پرنسپل ہونے کے دور میں تو گاؤن اور ٹوپی کی پابندی لازمی تھی کیونکہ وہ اکثر جرمانہ کر دیتے تھے، لیکن مکرم قاضی محمد اسلم صاحب کے دور میں کافی رعایت تھی اور جرمانہ نہیں ہوتا تھا۔

وہ نیاز و ناز کا ماجرا، وہ زمانہ شوق و شباب کا\
اسے بار بار نہ یاد کر، جو گزر گیا، سو گزر گیا

مسجد مبارک میں جمعہ کی نماز

ہوسٹل میں جو احمدی لڑکے رہتے تھے وہ جمعہ کی نماز کیلیے مسجد مبارک جایا کرتے تھے۔ ہوسٹل اور مسجد کا درمیانی فاصلہ کافی تھا اور شدید گرمیوں میں پیدل چل کر جانا کوئی آسان نہیں تھا۔ تمام سڑکیں کچی بجری والی تھیں اور گرد بھی بہت ہوتی تھی۔ ایک راستہ جو ہم طلباء اختیار کرتے تھے وہ ریل کی پٹری پر چل کر جاتا تھا۔ اسطرح گرد سے تو بچ جاتے لیکن ریل کی بجری مصیبت بنتی۔ پھر درمیانی لکڑی کے پھٹوں پر کود کود کر جانا شروع کر دیا۔ بعض دفعہ تپتی لوہے کی ریل کے اوپر سارا راستہ چل کر جاتے اور وہاں سے پہاڑی کے درّہ میں سے گزرتے جہاں پٹھان ہاتھوں میں ہتھوڑی لیے بڑے بڑے پتھر کوٹ کر بجری بنا رہے ہوتے۔ انسانی محنت اور غربت کی وہ مثال ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے ۔بقول اقبال

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

ایک دفعہ لڑکوں نے فیصلہ کیا کہ درّہ کی بجائے سیدھا جانا ہے اور بڑے پہاڑ کے اوپر سے پار کر کے جانا ہے۔ پاؤں میں ہوائی چپل، گرمی کی شدت اور پھر سب سے مشکل اور خطرناک راستہ۔ ہم سب لڑکوں نے ایسا ہی کیا اور خدا نے ہمیں کسی حادثہ سے بچائے رکھا، ورنہ ہم نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ کیا نڈر، اڈونچر اور بے وقوفی والی عمر تھی۔ نہ پہاڑ پر چڑھتے خوف اور نہ اترنے کا ڈر۔ کئی بار وہاں پہاڑوں پر چڑھے لیکن بفضلِ خدا بچے رہے۔

بابا شادی کو جرمانہ

بابا شادی بہت شریف النفس، سادہ اور ایک عجیب قسم کی مخلوق تھا۔ اپنی من مانی کرتا، قمیض بہت کم پہنتا، نیچے صرف ایک چھوٹی سی لنگی، آنکھوں پر ایک گول شیشے والی عینک جو اسکے ناک کے نیچے سرکی ہوئی، لڑکوں کے ساتھ گپ شپ اور مذاق، زبان ناشائستہ، کالج کا دیرینہ وفادار، سب رازوں سے واقف اور ہر چیز کا بھیدی بھی تھا۔ کالج کے پہلے پرنسپل مکرم حضرت مرزا ناصر احمد صاحب سے مضبوط تعلق رکھتا تھا۔ کالج کی سیڑھیوں کے نیچے ایک چھوٹے سے کمرہ میں اسکی رہائش تھی۔ سارا دن کالج میں رہتا اور رات کو ہوسٹل کے اندر سوتا تھا۔ کالج کی تمام چابیاں اسکے پاس ہوتیں اور سب سے بڑھ کر کالج کی کلاسوں کی گھنٹی بجانا بھی اسکا کام تھا۔ گھنٹی کیا تھی، ایک لوہے کا لٹکا ہوا بڑا سا توا اور بابا شادی کے ہاتھ میں لکڑی کا ہتھوڑا تھا جسکو وہ بہت شوق سے زور زور سے مارتا۔ یہ ہتھوڑا ہی اسکا سب سے کارآمد اور طاقتور اسلحہ تھا۔ بابا شادی کی اسی ٹلی کے بل پر ہی کالج کا نظام چلتا تھا۔ سب کلاسیں اسی سے شروع ہوتیں اور اسی ٹلی کی آواز پر ختم ہوتیں۔ مکرم قاضی محمد اسلم صاحب تو اپنی طبیعت کے لحاظ سے نرم خو تھے۔ انہوں نے بابا شادی کو ایسے ہی رہنے دیا۔ جب مکرم صوفی بشارت الرحمان صاحب قائم مقام پرنسپل کے فرائض انجام دینے لگے تو اپنی طبیعت کے لحاظ سے قدرے مذہبی اور سخت ڈسپلن کے قائل تھے۔ ہر طالب علم کو ٹوپی اور گاؤن میں دیکھنا چاہتے تھے۔ پرنسپل کے دفتر میں بغیر ٹوپی اور گاؤن داخلہ بالکل ممنوع تھا، بلکہ جرمانہ بھی کر دیتے تھے۔ اُن سے جرمانہ وغیرہ بھی

معاف کروانا اتنا آسان نہ تھا۔ کلاسوں کے درمیانی عرصہ میں طلباء جب برآمدہ میں گھومتے ہوئے مکرم صوفی صاحب کو دیکھتے تو فوراً گاؤن ٹوپی پہن لیتے۔ طلباء کیلئے تو ان پابندیوں کو ماننا انکی تعلیم کا حصہ تھا۔ مکرم صوفی صاحب نے کسی حد تک باباشادی کو بھی ڈسپلن کا حصہ بنانا چاہا کہ وہ کالج میں قمیض ضرور پہنے اور کم از کم پرنسپل کے کمرہ میں تو ضرور ٹھیک طرح سے کپڑے پہن کر داخل ہو۔ لیکن پرانا تجربہ کار اور عادات سے مجبور باباشادی کسطرح ایسی پابندیوں میں آسکتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ باباشادی پہلے کی طرح بغیر قمیض پرنسپل کے دفتر میں داخل ہو گیا۔ مکرم صوفی صاحب نے اسکو جرمانہ کرکے نوٹس بورڈ پر لگا دیا۔ باباشادی نے نوٹس بورڈ کے پاس کھڑا ہو کر زور زور سے شور کرکے بہت سے طلباء کو اکھٹا کر لیا اور اپنی عمومی بے لگام زبان سے جو ذہن میں آتا مکرم صوفی صاحب کے خلاف کہنا شروع کر دیا۔ لڑکوں کو تفریح کیلئے اس تماشہ سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا کہ کالج کا چپڑاسی کالج کے پرنسپل کے خلاف کھلا احتجاج کر رہا ہے جسکی کسی طالبعلم کو جرات نہ تھی۔ بار بار یہی کہتا کہ دیکھو صوفی نے مجھے جرمانہ کر دیا ہے۔ لڑکے اسکے ساتھ ہمدردی کرتے رہے اور مزا اٹھاتے رہے۔ مکرم صوفی صاحب نے اپنے لیے ایک مصیبت کھڑی کر لی تھی اور بلاآخر جان چھڑوانے کیلئے باباشادی کے جرمانے والا نوٹس اتارنا پڑا۔ اس دور کے بہت سے کالج کے طلباء اس واقعہ کی تصدیق کر سکتے ہیں

چوہدری محمد علی صاحب

چوہدری محمد علی صاحب ہمارے ہوسٹل وارڈن تھے اس لیے ان کے ساتھ ہمارا ہر وقت کا تعلق تھا۔ چوہدری صاحب طلباء کی سپورٹس میں بھی بہت دلچسپی لیتے تھے۔ کالج کی باسکٹ بال ٹیم کے بھی انچارج تھے۔ انکا رعب اور دبدبہ بھی بہت تھا۔ کالج میں استاد تو فلسفہ کے تھے لیکن ہر کوئی انکی انگریزی دانی سے زیادہ مرعوب تھا۔ چند خاص باتیں بھی انکے ساتھ منسوب تھیں۔ ان میں ایک تو یہ کہ موصوف خوشبو کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اپنے ہی ایک شعر میں غالباً اپنے بارہ میں ہی کہتے ہیں

ان کی پہچان ہے فقط خوشبو

لفظ گورے نہ سانولے صاحب

دوسری خاص بات یہ تھی کہ انکے موڈ اچانک تبدیل ہو جاتے تھے۔ ایک پل میں ہنس رہے ہیں اور دوسرے پل میں اچانک آنسوؤں کے ساتھ رونا شروع کر دیتے اور تیسرے پل میں غصہ میں بھی آجاتے اور جھڑکیاں بھی دینے لگ جاتے۔ رونے والی حالت میں ہمدردی کے جذبات ابھار لیتے، ہنسنے والی حالت میں محبت اور تعلق کا اظہار پیدا کر لیتے، غصہ اور جھڑک والی صورت میں خوف پیدا کر لیتے۔ اس وجہ سے لڑکے ان سے ڈرتے بھی تھے کہ نہ معلوم اگلے پل میں کیا ہو گا۔ ہمیں کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ سب حالتیں ان پر دانستہ تھیں یا انھیں واقعی اپنے جذبات پر کنٹرول نہ تھا، یا وہ درد آشنا حساس طبیعت رکھتے تھے۔ یہ تجربات دن میں کئی بار ہوتے لیکن یہ ضرور تھا کہ ایسی کیفیات لمحہ بھر ہی رہتیں۔ اچھے شاعر بھی تھے، اب کبھی سوچتا ہوں کہ شاید یہ سب حالتیں شعر کہنے کی کیفیت پیدا کرنے کی کوششیں ہی نہ ہوں؟ چوہدری صاحب کی عائلی زندگی کی مشکلات بھی تھیں ساری عمر اکیلے ہی رہے۔ ایک دفعہ یہ شعر پڑھا تو چوہدری صاحب کا رونا یاد آگیا۔

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب

دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آگیا

کئی سالوں بعد ایک دفعہ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ حکیم سقراط سے پہلے قدیم یونان کے ایک شہر میں جو آجکل ترکی کا حصہ ہے، تقریباً 500 سال قبل مسیح، ایک مشہور فلسفی ہراقلیطس (Heraclitus) گزرا ہے جو بات بات پر رو پڑتا تھا اسلئے تاریخ میں اسکا نام رونے والا فلسفی پڑ گیا۔ ہمارے کالج کے زمانہ میں شاید چوہدری صاحب ہی وہ فلسفی ہوں جن میں یونانی فلسفی کی روح دوبارہ سراعت کر گئی ہو۔ بہر حال یہ اچانک موڈ بدلنے والی حالت انکی شخصیت کا منفرد پہلو ضرور تھا۔ میں چوہدری صاحب کو پاکستان چھوڑنے کے ستائیس سال بعد آخری بار 2003ء میں لندن یوکے میں ملا تو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ میں سمجھا کہ ویسے ہی دلجوئی کی خاطر کہہ رہے ہیں، نام تو انکو یاد نہیں تھا لیکن کہنے لگے تم کھاریاں کے رہنے والے ہو۔ ہزاروں طلباء ان کی نظروں سے گزرے لیکن بلا کی یاداشت تھی۔ آپ کی پیدایش 1917ء میں جالندھر میں ہوئی 98 سال کی عمر میں ربوہ میں 2015ء میں وفات ہوئی۔ اللہ تعالی انکی مغفرت کرے عجب شخصیت کے مالک تھے۔ بقول شاعر

ہوا اڑائے پھرے گی گلی گلی تیری خشبو

ڈاکٹر ناصر پرویز پروازی صاحب

اگر میں یہ کہوں کہ مکرم پروازی صاحب کالج میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز استاد تھے تو یہ مبالغہ نہ ہو گا۔ موصوف عام بول چال تو پنجابی میں کرتے لیکن پڑھاتے اردو تھے۔ پڑھاتے کیا انکی کلاس شعر و شاعری کی ایک محفل ہی ہوتی تھی، اور وہ بھی عمدہ لطیفوں اور حاضر جوابی جملوں سے بھری ہوئی۔ وہ طلباء کی کلاس میں حاضری کبھی نہ لگاتے لیکن انکی کلاس میں حاضری سب سے زیادہ ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ جو بھی اپنی کلاس سے فارغ ہوتا خواہ کسی بھی درجہ میں ہوتا، وہ بھی شغل کی خاطر پروازی صاحب کی کلاس میں جا کر بیٹھ جاتا۔ اس لیے انہوں نے پرنسپل صاحب سے اجازت لے کر اپنی کلاس کو کالج کے بڑے ہال میں شفٹ کر دیا تھا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد وہ ٹک شاپ میں چلے جاتے جہاں کچھ طلباء بھی انکے ساتھ جا کر دھوئیں کے بادلوں کے درمیان محفل لگاتے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس زمانہ میں جو بھی طالب علم ٹی آئی کالج میں پڑھتا تھا اس کے اردو ادبی ذوق میں پروازی صاحب کا ہاتھ ضرور ہے۔ میری حد تک تو یہ بات بالکل درست ہے کہ شعر و شاعری پڑھنے کی چَس پروازی صاحب کی اردو کلاس ہی کا نتیجہ ہے۔ کالج میں مشاعروں کا انعقاد، اور ڈرامے سٹیج کروانا بھی انہیں کا کام تھا۔ جب 1969ء میں غالب کی سوسالہ برسی آئی تو مکرم پروازی صاحب نے طلباء کی ٹریننگ کر کے غالب کی زندگی پر نہایت عمدہ ڈرامہ تیار کیا اسکی یاد اور لطف ابھی تک باقی ہے۔ مکرم پروازی صاحب کالج میں بہت سے نامی گرامی ادبی شخصیتوں کو بھی مدعو کرتے اور مشاعرے کرواتے۔ اسی طرح چوہدری محمد علی صاحب کے ساتھ باسکٹ بال کی ٹیم کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ پروازی صاحب آجکل کینیڈا میں رہتے ہیں کبھی کبھار

چوہدری حمید اللہ صاحب

چوہدری صاحب کے بھائی میرے والد صاحب مرحوم کے قریبی دوست تھے انکی وساطت سے مکرم والد صاحب نے مکرم چوہدری

صاحب کو میرا ذاتی نگران مقرر کر دیا۔ انکا دفتر کالج کے ہال کے پیچھے ایک چھوٹے سے کمرہ میں ہوتا تھا۔ مجھے جب بھی کبھی کوئی مسئلہ ہوتا میں انکے دفتر میں بلا جھجک چلا جاتا اور وہ بڑے تحمل سے میری بات سنتے اور مناسب رہنمائی کرتے۔ مکرم چوہدری حمید اللہ صاحب بڑے ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ وہ کالج میں ہمیں حساب (Mathematics) پڑھایا کرتے تھے۔ وقت اور اصول کے پابند اور ہمیشہ کلاس کی حاضری بھی لگاتے تھے۔ انکے پڑھانے کا انداز نہایت عمدہ اور سلیس ہوتا تھا۔ ہر بات اور نقطہ کو بڑی احتیاط سے سمجھاتے۔

پاکستان میں اعشاریہ کا نظام کچھ سال پہلے جاری ہوا تھا۔ مجھے ابھی تک وہ کلاس یاد ہے جس میں مکرم چوہدری حمید اللہ صاحب نے ہمیں اعشاریہ کا غیر متناہی نظام اور (Concept of Infinity) سمجھایا۔ ایک لائن بلیک بورڈ پر لگا کر اسکو آدھا کیا، پھر اسکو آدھا کیا، پھر اسکو آدھا کرتے ہی گئے اور اسطرح سمجھایا کہ یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ میرے ذہن میں ابھی تک انکی آواز اور وہ تصویر محفوظ ہے جس وقت انہوں نے وہ لائن لگائی اور آہستہ آہستہ سمجھانا شروع کیا اور اپنی ہلکی آواز سے یہ فقرہ بھی دھراتے جاتے یہ سلسلہ چلتا چلا جائے گا، چلتا چلا جائے گا، چلتا چلا جائے گا اور کبھی ختم نہ ہو گا۔ کالج کے بعد چوہدری صاحب جماعت کا کام کرتے رہے اور بڑے بڑے عہدے بھی پائے مگر انکساری ہمیشہ انکا شعار رہا۔ میرا ان کے ساتھ انکی ساری عمر تک قریبی تعلق رہا۔ جب بھی کینیڈا آتے ان سے ملاقات ہوتی، میرے گھر بھی کھانے پر آتے۔ انکے بیٹے رشید اللہ کا کہنا ہے کہ جب بھی وہ والد صاحب کے ساتھ فون پر بات کرتا، چوہدری صاحب میرا حال اس سے ضرور پوچھتے اور باقاعدہ سلام بھی بھجواتے۔ اسی طرح کئی اور دوستوں کی وساطت سے بھی سلام و دعا بھجواتے رہتے۔ میری انکے ساتھ آخری ملاقات 2008ء میں کیلگری مسجد کے افتتاح کے موقع پر ہوئی۔ نہایت محبت سے ملے اور بہت عمدہ باتیں بھی کیں۔ اُن جیسے قابل، ایماندار، محنتی، قابل رشک اور مخلص انسان اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ حال ہی میں انکی وفات ہوئی ہے اور ہر طرف سے انکی یاد میں لوگوں نے بہت اچھی باتیں کہیں ہیں۔ اللہ تعالی ان پر بیشمار رحمتیں نازل کرے۔ بقول شاعر

موت اسکی ہے کرے جسکا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کیلئے

مکرم شریف خالد صاحب

مکرم شریف خالد صاحب اپنی طبیعت کے لحاظ سے بہت سادہ، نرم خو، طلباء سے محبت کرنے والے، اور دوست قسم کے آدمی تھے۔ طلباء نے بے تکلفی میں انکا نام چاچا شریف خالد رکھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے لیکن اگر سچ کہوں تو ہمارے انگریزی کے دیہاتی مبلغ تھے۔ ساری انگریزی تقریباً پنجابی میں ہی پڑھاتے تھے۔ خود بھی اپنی مدد آپ کے تحت کاغذ پر انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ لکھ کر ساتھ لاتے۔ طلباء کو کبھی اس بات کی سمجھ نہ آئی کہ انکو انگریزی پڑھانے میں کیسے دلچسپی پیدا ہوئی۔ کئی کبھار انکی غیر موجودگی میں مکرم مرزا خورشید احمد صاحب بھی انگریزی کی کلاس پڑھاتے تو پھر معلوم ہوتا کہ یہ زبان کس طرح بولی جاتی ہے۔ کچھ سالوں کے بعد وہ گھٹیالیاں میں کسی کالج کے پرنسپل بن کر چلے گئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے آپ وفات پا چکے ہے۔ اللہ انکی تربت پر ہزار رحمت کرے۔ ہر مسافر کو کسی گھاٹ پہ

اتر جاتا ہے۔

مکرم محمد اسلم منگلا صاحب

مکرم اسلم منگلا صاحب سے کالج میں تو میں نے کوئی کلاس نہیں پڑھی لیکن وہ ہمارے ہوسٹل کے ایک نگران تھے۔ مرحوم نہایت شریف اور بہت عمدہ انسان تھے۔ طبیعت میں حیا اور بردباری تھی۔ ایم اے اسلامیات کرنے کے بعد انکی ہوسٹل میں نئی نئی تقرری ہوئی تھی اور ابھی تجربہ بھی نہیں تھا، اسلئے ابھی خود اعتمادی بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لڑکوں کے ہجوم میں بات کرتے ہوئے کچھ گھبرا سے جاتے تھے۔ ہوسٹل میں رہنے والے طلباء پاکستان کے مختلف شہروں، گاؤں اور جگہ جگہ سے آئے تھے۔ عمر بھی اکثر کی کچی تھی اور شرارتوں سے بھرپور تخلیقی دماغ بھی تھا۔ جونہی طلباء کو انکی ناتجربہ کاری کا احساس ہوا تو پھر انکو مزید تنگ کرنا شروع کر دیتے۔ بعض اوقات تو بچارے روہانسے ہو جاتے۔ اب اس بات کو پچاس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر مجھے آج تک اس بات کا احساس ہے کہ موصوف منگلا صاحب کے ساتھ ہوسٹل کے کچھ لڑکے خوامخواہ زیادتی کرتے تھے۔ کالج کے بعد وہ پرائیویٹ سیکرٹری کے دفتر میں چلے گئے اور باقی ساری عمر اسی دفتر کی خدمت میں گزار دی۔ منگلا صاحب مرحوم مجسم شرافت تھے۔ اللہ تعالی انکی تربت پر ہزار رحمت بھیجے اور ہم سب طلباء کو معاف بھی کرے۔ اب دیکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہر گز۔

حرف آخر

ٹی آئی کالج اور فضل عمر ہوسٹل کو چھوڑے ہوئے پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے ہوسٹل میں بھی رہا ہوں، اور پھر کینیڈا میں یونیورسٹی میں بھی رہا ہوں لیکن جو یادیں فضل عمر ہوسٹل کے دور کی ہیں انکا مقابلہ بعد کی طالبعلمی زندگی سے نہیں ہو سکتا۔ جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ حکومت پاکستان کی طرف سے 1972ء میں تعلیمی ادارے قومیانے سے پہلے کا دور ہے۔ خاص کر ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں کالج اپنے تعلیمی اور ادبی اعتبار سے بہت عروج پر تھا۔ ٹی آئی کالج ان چند محدود تعلیمی اداروں میں سے ایک تھا جس نے ایم ایس سی فزکس کی کلاسیں بھی شروع کر دی تھیں، اور کیمسٹری میں ایم ایس سی کی کلاسیں شروع کرنے کی پلاننگ بھی ہو رہی تھی۔ عموماً ان مضامین میں ایم ایس سی کرنے کیلئے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہوتا تھا۔ کالج طلباء کی سپورٹس کے میدان میں بھی صف اوّل کا درجہ رکھتا تھا۔ متواتر کئی سال کشتی رانی میں پنجاب یونیورسٹی کا چمپئین رہا۔ اسی طرح باسکٹ بال کے میدان میں بھی ٹی آئی کالج کی ٹیم کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ میرے وہاں ہوتے ہوئے آل پاکستان باسکٹ بال چمپئین کا مقابلہ بھی اُسی کالج میں ہوا جس میں پورے پاکستان سے ٹیمیں کھیلنے کیلئے وہاں آئیں۔ ہوسٹل کے کمرے ہم سے خالی کرا کر مہمان ٹیموں کو دیے گئے۔ کالج میں طلباء کی یونین بھی تھی، انتخاب بھی ہوتے تھے لیکن نہ کبھی طلباء نے کوئی ہڑتال کی، نہ کوئی توڑ پھوڑ، اور نہ کسی قسم کا ہنگامہ۔ اساتذہ اور طلباء کا آپس میں رشتہ نہایت باادب اور دوستانہ تھا۔ باقاعدہ کلاسوں کی تعلیم کے علاوہ، مشاعرے، ڈرامے، ادبی محفلیں، تقریری مقابلے، کھیلیں اور طرح طرح کی دیگر سرگرمیاں بھی کالج کی زندگی کا حصہ تھیں۔ انہی وجوہات کی بنا پر دور دور سے طلباء، احمدی بھی اور دوسرے مسلمان بھی، بلالحاظ فرقہ کالج

میں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ فضل عمر ہوسٹل میں بھی طلباء کی رہایش، حفاظت، اور دیکھ بھال کا نہایت عمدہ انتظام تھا۔ کالج تو شاید اب بھی قائم ہے اور سننے میں آیا ہے کہ حکومت نے کالج کی اب نئی عمارت بھی تعمیر کی ہے۔ لیکن وہ باتیں کہاں؟ میری یادیں تو کسی اور زمانہ سے تعلق رکھتیں ہیں۔ یہ وہ نادر دوَر تھا جب پاکستان میں کفر سازی کی باقاعدہ فیکٹری کا پلانٹ نہیں لگا تھا۔ وہ اساتذہ ہی اور تھے، وہ طلباء ہی اور تھے ، وہ ماحول ہی اور تھا۔ وہ طلباء جو اُس دوَر میں اِس کالج میں طالبعلم رہے ہیں وہ سب ہی اس حقیقت کی کھلے طور پر تصدیق کر سکتے ہیں۔ حال ہی میں کوئی پرانا طالب علم اپنی یادوں کی محبت میں ٹی آئی کالج کو دیکھنے ربوہ گیا تو وہاں سے پرانی عمارت کی تصویریں اور ویڈیو بنالایا اور انٹرنیٹ پر دوستوں کو بجھوادیں۔ کسی نے مجھے بھی وہ تصویریں بجھوادیں۔ جن محبت بھری آنکھوں سے کالج نے ہمیں دیکھا، انہی آنکھوں سے ہم نے دنیا کو دیکھا، اور انہی آنکھوں سے کالج کے کھنڈرات کو دیکھ کر بہت ہی دکھ ہوا۔ یہ وہ کالج تھا جس نے ہمیں اسوقت شعور دیا، تعلیم دی، اور زندگی کی راہ دکھائی، جب ہمیں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ یہ وہ کالج تھا جہاں پورے ملک کے وزیر، سفیر، افسران، شعراء کرام، ادبی شخصیات، سائنسدان وغیرہ اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تک بھی آنا فخر محسوس کرتے تھے۔

کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی
یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی

Fazal-e-Omar Hostel Office bearers (1968-69)

Chairs (L to R) Ch. Tahir Sadiq(V President Mess), Masood Khalid Malik(Prefect) , Ch. Mohammad Anwar (Prefect), Prof Mohammad Ali Choudhry M.A. (Suprn & (Warden), Prof Qazi Mohammad Aslam(M.A. (Cantab) Principal), Ch. Tahir Ahmad Bajwa(Chief Prefect), Ch. Mohammad Akram (V President Common Room), Abdul Khalid Negyal (Hon. Sec Mess). Standing (L to R) Zahid Mahmood (Assit. Sec. Common Room), Asadullah Khan Zahoor (Assit Sec Mess), Ch. Riaz-ul-Aziz (Member Mess), Ibn-ul-Islam (Sec forum Society), Ch. Abdur Rauf(Sec Mess), Ch. Maaz Ullah(Secc Mess), Sana Ullah Malik (Member Mess).
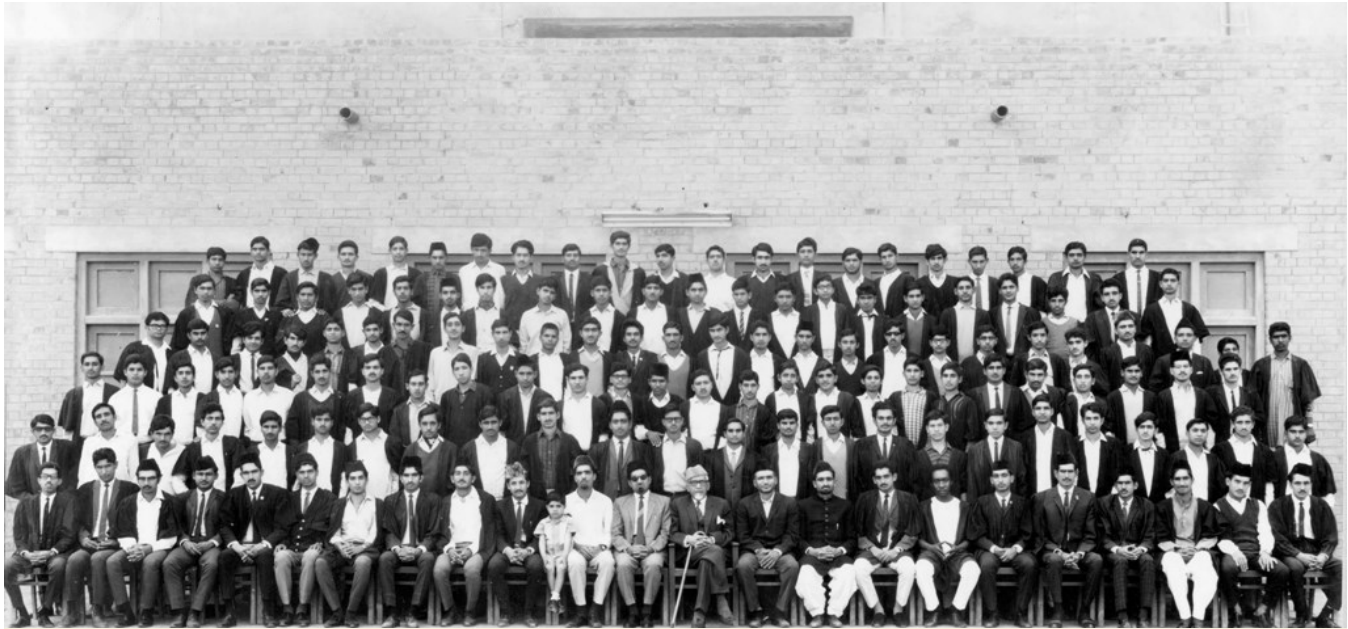
GENERAL GROUP PHOTOGRAPH

Fazal-i-Umar Hostel Rabwah.

Session 1969 - 70

Chairs (L to R) Mubasher, M. Yar, Asim Sehrai, Ibn-ul-Islam, M. Hussain, (V. President Forum) Abdus Sammi, (Judge H Court.) Abdur Rauf, (President Mess Prefect) Riaz-ul-Aziz, (Prefect) Masood Khalid, (Chief Prefect)
Sh. Shamim Khalid, (M.A. Tutor) Prof. Mohammad Ali Choudhry, (M A. Warden) Prof. Qazi Mohammad Aslam, (M.A. (Cantab) Principal) Saeed Ullah Khan, (M A Tutor) Mohammad Aslam, (M.A. Tutor)
Maazullah, (Prefect) H. Mbano, (Prefect) Sanaullah, (Auditor) Jafar Mahmood, (V. President Common Room) Zafar Sahi, (V. President Mess) Mubasher, Zulfiqar, Zulfiqar.

Standing 1st Row:- Nasir, Safdir, Ghafoor, Shamim, Anwar, Arshad, Anwar, Musaddeq, Riaz, Maqsood, Basharat, Mohd Ali, M.Sc. Pre. Asghar M.Sc. I, Munir M.Sc. I, Safdar M.Sc. I, Qadir, Ilyas, Saghir, Nemat, Nizam, Fazal, Ishaq, Nasir, Faqir.

Standing 2nd Row:- Musaddiq. Shaukat, Ijaz, Zaheer, Mubarik, Masood, Zaka, Ishfaq, Javid, Mubasher, Masood, Salim, Rauf, Javaid, Akhtar, Zafaf, Munir, Pervez, Talat, Ata, Mumtaz, Abdullah, Ijaz, Irshad, Naseer, Noor.

Standing 3rd Row:- Allah Dad, Muzaffar, Bashir, Mubasher, Tasleem, Hafiz, Hasan, Farooq, Qadeer, Manzoor, Munawwar, A. Raza, Jabbar, Khalid, Iltaf, Javaid, Akhtar, Iftikhar, Ata, Ishfaq, Mubasher, Noor, Ghazanfer, Ihsan, Khalid, Malik.

Standing 4th Row:- Mahboob, Kosar, Bashir, Ashraf Qamar, Latif, Liaqat, Falak Sher, Imtiaz, Mushtaq. Abbas, Hafeez, M. Ahmad, Akhter, Luckoo, Zaheer, Allah Datta, Hamid. Afzal, Javid, Saghir,

5th Row:- Zaheer, Munawwar, Aslam, akram, Qammar, Ijaz, Nasar, Ali, Muzaffar, Shaukat, Ijaz Saddique, Riaz, Khaliq, Yousaf, Shakoor, Iftekhar, Munawwar, Nascer, Nisar, Muzaffer.

GILANI Photo Studio Lyp.

Fazal-e-Omar Hostel Office bearers 1969-70

Chairs (L to R) Zafar Sahi, Jaafar Mahmood, Sanaullah Malik, Hamid R. Mbano, Maazallh Bhatti, Ch. Muhammad Ali, Prof. Qazi Mohammad Aslam (Principal), Malik Masood Ahmad Khalid, Riaz-ul-Aziz, Abdul Rauf, Abdul Sami, Mohammad Hussain
Standing (L to R) (1) Naseer Bajwa, Rana Mohammad Anwar, Muzaffar Bajwa, Musaddaq Masood, Bashar Athmad, Ata-ul-Qadir, Ahmad Riaz, Maqsood Ahmad, Muzaffar Ahmad

ڈھلنے لگا سورج تو بڑھے شام کے سائے
تم ایسے گئے ہو کہ نہیں لوٹ کے آئے

یا رب یہ شب ہجر تو کاٹے نہیں کٹتی
بہتا ہے لہو آنکھ سے اشکوں کی بجائے

خاموش نگاہوں میں ہے اظہارِ تمنّا
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں طوفان چھپائے

کل پرسوں کی اُمید نے برسوں کو سمیٹا
کب تک کوئی آشا کے چراغوں کو جلائے

کس طرح کوئی حُسن ترا دل سے اُتارے
کس طرح کوئی تیری جوانی کو بھلائے

جو شعر کہے میں نے فقط آپ کی خاطر
میرے ہی زبانی نہ سنے آپ نے ہائے

آنسو سے بڑا کوئی مصوِر نہیں عابدؔ
جو خون سے جذبات کی تصویر بنائے

("برگ برگ چاندنی" سے انتخاب)

مبارک عابد

ستارے بجھ گئے تو آسماں کیسا لگے گا
جہانِ تیرگی میں یہ جہاں' کیسا لگے گا

بچھڑ کر ساحلوں سے موجِ دل' کیسی لگے گی
بکھر کر آندھیوں میں بادباں، کیسا لگے گا

ٹھہر جائیں گی جب یہ کشتیاں۔۔ کیسی لگیں گی
گذر جائے گا جب آبِ رواں ،کیسا لگے گا

عمارت ڈھے چکی ہو گی جو سانسیں ٹوٹنے سے
تو پھر یہ سایہ دیوارِ جاں ،کیسا لگے گا

اتر جائے گا رنگِ عاشقی جب اُس کے خوں سے
تو دل بیگانہِ سود و زیاں ، کیسا لگے گا

قفس کیسا لگے گا ، اُڑ گئے جب گاتے پنچھی
نہ ہو گا جب کوئی شورِ فغاں، کیسا لگے گا

بکھر جائیں گی زنجیریں سبھی زندانیوں کی
زوالِ نخوَتِ نا مہرباں ، کیسا لگے گا

بہُت رنگینیاں ہوں گی اگرچہ رہ میں صابرؔ
مسافر کھو گیا تو کارواں ،کیسا لگے گا

صابر ظفرؔ

جمیل الرحمان

موسم اور مسافر خواب دکھاتے ہیں
زرد شجر کے پتے شور مچاتے ہیں

زندہ ہیں اور وقت نہیں ہے جینے کا
ہم تو بس جینے کی رسم نبھاتے ہیں

یاد علی بابا کو کوئی اسم نہیں
چور عبث کیوں اپنی رات گنواتے ہیں

کیسے دن کی راکھ ہے جس کو چٹکی بھر
دریا دریا پاگل روز بہاتے ہیں

قید ہے کوئی آندھی گھر کے آنگن میں
ہم دیواریں اونچی کرتے جاتے ہیں

سو جاتی ہے جب آواز پرندوں کی
اک دہشت کے سائے پر پھیلاتے ہیں

دل پر حد جاری ہونے کی خبر جمیل
جنہیں سنائی کیا کیا مجھے سناتے ہیں

احمد مبارک

بیٹھے بیٹھے ہی بہت نام مجھے چاہیے ہے
اپنی توصیف تو ہر گام مجھے چاہیے ہے

اپنا کردار بھی میں اس میں ُ چھپا سکتا ہوں
بس یہ اک جامہء احرام مجھے چاہیے ہے

جس کو چاہوں میں جہاں چاہوں بنا دوں کافر
ان دنوں ایسا ہی اسلام مجھے چاہیے ہے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں شام تلک
اور اسی بات کا انعام مجھے چاہیے ہے

جا بھی سکتا ہوں پلٹ کر ترے در کی جانب
لیکن اس وقت تو آرام مجھے چاہیے ہے

جا نکلنا تھا کسی جھونک میں افلاک کے پار
ہے کہاں ؟ جو تہہِ اجرام ، مجھے چاہیے ہے

قصہ گو وقت کہاں ساری کہانی کے لیئے
دیر مت کر فقط انجام مجھے چاہیے ہے

اک کتابوں سے بھری صبح ہے درکار مجھے
اور اک مے سے بھری شام مجھے چاہیے ہے

اپنی بے کاری سے کچھ تنگ بھی آیا ہوا ہوں
اب تو کرنے کو کوئ کام مجھے چاہیے ہے

احمد مبارک

عارف ثاقبؔ

یہ وجود عالم رنگ و بو، یہ مثال ہے یا خیال ہے
مری آگہی کے نصیب میں یہی اک سلگتا سوال ہے

جو کبھی نہ خود سے نکل سکوں، تو تمہاری جانب نظر کروں
میں اسیر اپنے جنوں کا ہوں، مجھے کب تمہارا خیال ہے

یہی اک مآل ہے زیست کا کہ خوشی یہاں ہے گریز پا
غمِ مُستقل مجھے کر عطا، یہ مری بقا کا سوال ہے

وہ جو ایک شخص نہ مل سکا، تو یہ دل کا غنچہ نہ کِھل سکا
مری داستاں بھی عجیب ہے، کہ نہ ہجر ہے نہ وصال ہے

میں کسی کے پاس نہ جا سکا، کوئی میرے پاس نہ آ سکا
یہ مری جو صورتِ حال ہے، یہ تری نظر کا کمال ہے

کہ کہاں پہ آ کے ٹھہر گیا، مرے جذبِ شوق کا مرحلہ
نہ عروج ہے میری تلاش میں نہ ہی جستجو میں زوال ہے

میری آرزوئیں ہیں نا رسا، وہ مرے خیال سے ماورا
اُسے دیکھنے کی تو بات کیا، جسے سوچنا بھی محال ہے

ادھورے لمحے کی ایک ادھوری نظم

راتوں میں ایک رات تھی
پورے چاند کی رات تھی
چاندنی نہ تھی کہیں
چاندنی کا احساس تھا
لمحہ لمحہ پگھلتی ہوئی
ہاتھوں سے پھسلتی رات تھی
خشک ہونٹوں پہ جمی ہوئی
جنم جنم کی پیاس تھی
اپنے خیالوں میں گُم کہیں
وہ دور تھی نہ پاس تھی
دھیان کے آتش دان میں
زرد پتوں کا ڈھیر تھا
جو دل کو چھو کے گزر گئی
وہ گئے دنوں کی باس تھی

ناصر جمیل

اب تک مری نگاہ میں کوئی بسا نہ تھا
میں جس کو ڈھونڈتا تھا وہ تیرے سوا نہ تھا

کیا ہے وفا ناآشنا یہ طرزِ گفتگو
جو تو نے کہہ دیا ہے کسی نے کہا نہ تھا

میں اس سے شکوہ سنج تھا وہ مجھ سے بدگماں
اس کشمکش میں پیار کا کوئی مزا نہ تھا

اک میں کہ تجھ کو سمجھا کیا روحِ زندگی
اک تو کہ اس طرح سے کبھی سوچتا نہ تھا

یوں اجنبی نظر سے مجھے دیکھتے ہو تم
جیسے جہاں میں کوئی کسی کا ہوا نہ تھا

بے تابیوں کی گود میں کتنا اداس ہوں
میں نے بھی دل کسی کو یہ اب تک دیا نہ تھا

دل سے مجھے اتار لیکن یہ یاد رکھ
دنیا تجھے کہے گی کہ طاہرؔ برا نہ تھا

طاہر مجید

منفرد لہجے کے اردو شاعر ڈاکٹر ابرار احمد 29 نومبر 2021 کو 67 برس کی عمر میں ہم سے جدا ہو گئے
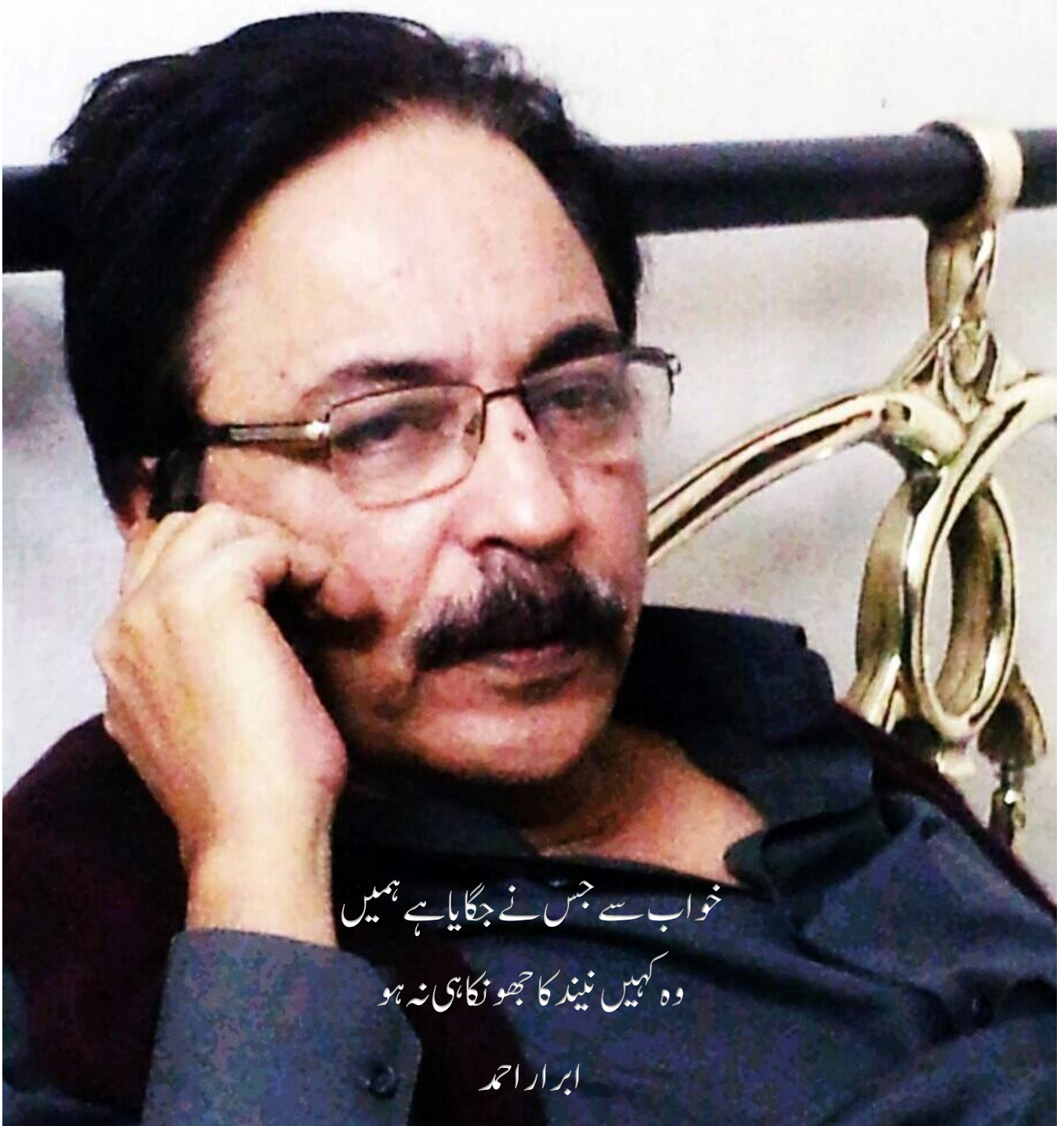
ڈاکٹر ابرار احمد کی وفات پر معاصرین کے تعزیتی مضامین جو پاکستان کے اخبارات اور سوشل میڈیا میں شائع ہوئے۔

ابرار احمد: مرحوم کی مہک

ڈاکٹر ابرار احمد کی زندگی اور کام پر جدید شاعر ادریس بابر کی تحریر۔

انڈیپینڈنٹ اردو۔ ہفتہ ۳۰ اکتوبر ۲۰۲۱

ادریس بابر

بندہ ڈاکٹر ہو بلکہ ای این ٹی سپشلسٹ ہو اور وہ بھی گولڈ میڈلسٹ، لاہور کے بڑے ہسپتال میں صدر شعبہ ہو اور بڑی آبادی میں پرائیویٹ پریکٹس کا مالک بھی تو اس کے پاس کان کھجانے کی فرصت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن ابرار صاحب کا معاملہ اس سے بالکل برعکس تھا۔

انہوں نے اس مصروف زندگی میں ادب و شعر کے لیے نہ صرف جز وقتی وقت نکالا، بلکہ اتنی بھرپور شاعری کی کہ ان کی کل وقتی پروفیشنل شخصیت اس کے نیچے کہیں دب کر رہ گئی۔

ڈاکٹر ابرار احمد جب ملتان کے نشتر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کر رہے تھے تب سے ادبی حلقوں میں جانے مانے جانے لگے تھے۔ لاہور منتقلی کے بعد یہ جان پہچان بڑھتی چلی گئی۔ وہ حلقہ ارباب ذوق کے فعال ترین ارکان میں سے تھے۔ حلقے کی مجلس عاملہ میں شامل رہے اور بیسیوں بار صدارت بھی کی۔

عمر کے لحاظ سے بڑا ہو یا چھوٹا، ادبی اعتبار سے سینئر ہو یا جونیئر، نظریاتی طور پر لیفٹ کا ہو یا رائٹ کا، ادیبوں شاعروں کے لیے ان کے پاس ہمیشہ وقت ہوتا۔ کوئی یورپ پلٹ دیسی ہو یا کوئی مضافاتی طالب علم، ان کی محبت سب کے لیے عام تھی، ان کی مسکراہٹ سب کے لیے خاص تھی۔

ابرار احمد غزل بھی شروع دن سے نہ صرف یہ کہ لکھتے تھے بلکہ ان کی غزلوں کا کم از کم ایک مجموعہ بھی شائع ہوا، 'غفلت کے برابر۔' نام سے قطع نظر، یہ ان کی طرف سے کوئی غفلت ہرگز نہ تھی، شاید ایسا وہ جان بوجھ کر بھی نہیں کرتے تھے۔ دراصل ان کے چھوٹے بھائی افضال نوید غزل کے بڑے عمدہ شاعر ہیں، تو پھر معاصرانہ بھی کیا یہ تو بس برادرانہ چشمک ہوئی۔

بہر طور جدید غزل پر ان کا ایک معرکہ آرا مضمون پہلے 'گل بکاولی' نام کے پرچے میں اور پھر 'شب خون' میں چھپا۔ آصف فرخی مرحوم کے رسالے 'دنیازاد' مرحوم میں بھی مرحومہ فہمیدہ ریاض اور بعض دیگر مرحومین سے تا دیر ان کی معصومانہ بحثیں چلتی رہیں جن سے نو

آموز لطف اٹھاتے رہے، سیکھتے رہے۔

اس سب کے باوجود، ابرار احمد کی بنیادی ادبی پہچان نظم کے حوالے سے ہی بنی اور قائم رہی۔ وہ نثری نظم کے لاہوری سکول سے وابستہ تھے اور اس ژانرے کے دبنگ وکیل تھے۔ 'آخری دن سے پہلے' ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو 1994 میں شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

بعض اوقات حیرانی ہوتی ہے کہ ایک واضح طور پہ جدید شاعر کی غزل کا لب و لہجہ روایتی رہا۔ بالکل ایسا ہی ہے، اور اس لیے ہے کہ یہ روایتی رنگ شاعر نے خود ہی منتخب کیا۔ کیوں کیا؟ اس کا جواب بھی اس کی غزل میں مل جاتا ہے۔

ابرار کی غزل میں خوامخواہ کی جدت اوڑھنے کی بجائے شاعر کا سارا زور اپنی واردات کے بیان پر ہے۔ اسے گزارشِ احوالِ واقعی مقصود ہے اور یہی کاوش اس کلام کو پر اثر بناتی ہے۔

نظم کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں آپ کو سب کچھ ملے گا۔ وجودی تنہائی سے صوفیانہ واردات تک، احساسِ مرگ سے لاادریت تک۔ یہ نظمیں ہمارے بدلتے ہوئے سماج میں جدید انسان کو درپیش قدیم مسائل کا مکمل ادراک بھی رکھتی ہیں اور اس کا مفصل اظہار بھی کرتی ہیں۔ طویل نظم 'سیر بین' اس کی محض ایک مثال ہے۔

ابرار احمد کی نظموں کا کینوس وسیع ہے۔ کہیں وہ 'میر کو پڑھتے ہوئے' پائے جاتے ہیں تو کہیں 'قصباتی لڑکوں کا گیت' گاتے پھرتے ہیں۔ ابھی دوستوسکی کے شہرہ آفاق ناول برادرز کرامازوف کی دنیا میں سیر کر رہے تھے کہ ایک دم کسی 'موہوم سی مہک' پا کر موت سے مکالمہ کرنے چل کھڑے ہوئے۔ اور یہ میچ تو ہمیشہ یک طرفہ ثابت ہوتا آیا ہے۔

ڈھائی دہائیوں کے طویل وقفے اور عنوان سمیت مواد میں بارہا تبدیلیوں کے بعد، ڈاکٹر ابرار احمد کی نظموں کا دوسرا مجموعہ 2019 میں، موہوم کی مہک کے نام سے شائع ہوا اور بجا طور پہ تحسین کی نظر سے دیکھا گیا۔ بعد میں مرحوم کی اسی کتاب کو یو بی ایل ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

ابرار احمد کو اکادمی ادبیات پاکستان کے لیے پاکستانی ادب کا سالانہ انتخاب مرتب کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ جبکہ خود ڈاکٹر صاحب مرحوم کے فکر و فن پر ملک کی کئی جامعات میں مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اس رثائیے کے آخر میں ابرار کی ایک شاہکار نظم من و عن کوٹ کرنا بنتا ہے:

قصباتی لڑکوں کا گیت

ہم تیری صبحوں کی اوس میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ
دنوں کی اس بستی کو دیکھتے ہیں

ہم تیرے خوش الحان پرندے، ہر جانب
تیری منڈیریں کھوجتے ہیں
ہم نکلے تھے تیرے ماتھے کے لیے
بوسہ ڈھونڈنے
ہم آئیں گے بوجھل قدموں کے ساتھ
تیرے تاریک حجروں میں پھرنے کے لیے
تیرے سینے پر
اپنی اکتاہٹوں کے پھول بچھانے
سر پھری ہوا کے ساتھ
تیرے خالی چوباروں میں پھرنے کے لیے
تیرے صحنوں سے اٹھتے دھویں کو اپنی آنکھوں میں بھرنے
تیرے اجلے بچوں کی میلی آستینوں سے، اپنے آنسو پونچھنے
تیری کائی زدہ دیواروں سے لپٹ جانے کو
ہم آئیں گے
نیند اور بچپن کی خوشبو میں سوئی
تیری راتوں کی چھت پر، اجلی چارپایاں بچھانے
موتیے کے پھولوں سے پرے، اپنی چیختی تنہائیاں اٹھانے
ہم لوٹیں گے تیری جانب
اور دیکھیں گے تیری بوڑھی اینٹوں کو
عمروں کے رتجگے سے دکھتی آنکھوں کے ساتھ
اونچے نیچے مکانوں میں گھیرے، گذشتہ کے گڑھے میں
ایک بار پھر گرنے کے لیے
لمبی تان کر سونے کے لیے
ہم آئیں گے

شیر ازراج

تیرے مضافات میں مٹی ہونے کے لیے!

ڈاکٹر ابرار احمد: جو آہا، سو آہا

شیر ازراج

ہم سب ۱۳۱ اکتوبر ۲۰۲۱

ڈاکٹر ابرار احمد صاحب سے آخری مرتبہ لمبی گپ شپ علی افتخار جعفری کی بیماری کے دنوں میں ہوئی تھی۔ تنویر جہاں اور انوار ناصر سے پوچھتا رہتا تھا، کبھی کسی سے، کبھی کسی سے، کیا مسئلہ ہے، اٹھ کیوں نہیں رہا، یہ کیسا کومہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان سب میں ڈاکٹر صاحب سے مسلسل بات ہونا ہی تھی۔ جعفری کی مسلسل نیند کا پلڑا وہ اپنی مسلسل بیداری سے برابر کیے ہوئے تھے۔ پھر جعفری چلا گیا۔ میں نے دو نظمیں کہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی ایک نظم کہی، لیکن ہم نے ایک دوسرے سے افسوس نہیں کیا، افسوس تھا ہی نہیں۔ وہ کیفیت نجانے کیا تھی، امجد طفیل، ضیا الحسن، اظہر غوری، اور بے شمار دوسرے، کسی کو بھی افسوس نہیں تھا، سب سناٹے میں تھے، ہتھیار ڈال دینے کے بعد کا سکوت۔

مذکورہ بالا لمبی گپ شپ کے سلسلے کا ایک موضوع حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری کے عہدہ کے لیے میرا الیکشن بھی تھا۔ یہ ہماری بڑی پر لطف یاد تھی۔ وہ الیکشن حلقہ ارباب ذوق لاہور کے چند بڑے ادبی معرکوں میں سے ایک تھا۔ میرا ہارنا محال تھا کہ میرے ایک طرف علی افتخار جعفری تھا اور دوسری طرف امیر حسین جعفری۔ ادھر شاہد عثمان تھا تو ادھر آفتاب جاوید، نسرین انجم بھٹی اور کنول فیروز۔ لاہور نے حلقہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک غیر مسلم کو تاریخ کی (شاید) سب سے بڑی لیڈ سے جتوایا تھا۔ سازش بہر حال حسین مجروح اور نواز کھرل کی تھی۔ ڈاکٹر ابرار اس جیت کے مرکزی منصوبہ سازوں میں سے ایک تھا اور ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ ضیا الحسن، امجد طفیل، محمد خالد کا نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ ان دنوں ہماری ثقافتی تنظیم الاپ کا دفتر ماڈل ٹاون حسین مجروح صاحب کی پچھلی گلی اور ڈاکٹر صاحب کے پچھلے بلاک میں تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب سے ساتھ بہت ملاقاتیں رہیں، بہت باتیں، بہت زیادہ۔

اس سے پہلے بس ایم اے او کالج کا ایک دفتر یاد آتا ہے، عالم فاضل، باغی اور صوفی۔۔۔ محمد خالد کا دفتر جہاں پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہی دنوں علی افتخار جعفری سے بھی پہلی ملاقات اسی دفتر میں ہوئی۔ اظہر غوری کو بھی پہلی مرتبہ یہیں دیکھا، اور حیرت ہوئی کہ کوئی انسان اپنے ناپ سے اتنی چھوٹی جیکٹ کیسے اور کیوں کر پہن سکتا ہے۔ علی افتخار جس طرح اظہر غوری کی نقل اتارتا تھا، وہ خود اظہر غوری بھی نہیں کر سکتا۔

یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا ہوں، پتہ نہیں۔ ایک طرح کا دفاعی نظام ہے۔ مجھے یاد ہے جب جاوید انور کی خبر آئی تو اسی رات نظم ہو گئی تھی اور معلوم تھا کہ اگر نظم نہ کہی تو مر جاؤں گا میں بھی۔ نظم جب فیس بک پر پوسٹ کی تو حسین عابد کی نظم پوسٹ ہو چکی تھی۔ بعد ازاں اس نے بھی یہی کہا کہ نظم کہے بنا چارہ نہ تھا۔ آج گلناز کوثر نے نظم کہی ہے ڈاکٹر ابرار پر، اس لیے نہیں کہ اسے شہرت کی کوئی طلب ہے یا وہ نظموں کے سلسلے میں پہل کرنا چاہتی ہے اور داد مانگتی ہے۔ یہ خود حفاظتی نظام ہے بھائی۔ وہ نظم نہیں کہے گی تو ٹوٹ جائے گی، دھاگے کی طرح، تنکے کی طرح۔۔۔

سو افسوس جعفری کا بھی نہیں ہوا تھا، محمد خالد کا بھی نہیں اور افسوس ڈاکٹر ابرار کا بھی نہیں ہے۔ اس مرتبہ بھی ایک سناٹا ہے اور حیرت بھرا احساس کہ لاہور کے ادبی منظر نامے سے محمد خالد، ڈاکٹر ابرار احمد، علی افتخار جعفری کی مثلث ختم ہو گئی۔ پورے ہو گئے تینوں؟ باکمال شاعر، نقاد، زندہ دل، جری اور یاروں کے یار، فطری لیڈر، فطری باغی، فطری استاد۔۔۔ اور ہاں تینوں کے مخالف اور حاسد ان کی عزت کرتے تھے، اور بڑے دل سے۔

علی افتخار جعفری کی رحلت پر ڈاکٹر صاحب نے کچھ نظمیں سنائی تھیں۔ کچھ پرانی شاعری۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ نے جن نظموں کا انتخاب کیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ آپ مر رہے ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ کون بھول سکتا ہے، اسی لازوال مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے جو جواب دیا تھا، وہ اس خود حفاظتی تحریر کا عنوان ہے، جو آیا، سو آیا۔۔۔

اور کیا رہ گیا ہے ہونے کو
چار آنسو نہیں ہیں رونے کو
خواب اچھے رہیں گے ان دیکھے
خاک اچھی رہے گی سونے کو

بہت خوب ڈاکٹر صاحب، کیا کہنے، واہ واہ...

ہم کیا کریں گے ڈاکٹر ابرار احمد!

ڈاکٹر عنبرین صلاح الدین

ڈاکٹر عنبرین صلاح الدین

ہم سب 13/11/2021

"تمہاری کتاب کے اوراق اڑ رہے ہیں / میری نظموں کے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔" اور وہ شام گزر چکی ہے۔ ایوان کر امازوف پوچھتا ہے، ہم کیا کریں گے ڈاکٹر ابرار؟ نظموں کے کرداروں کے سب خواب پیچ سے شکست ہو چکے۔ "ٹوٹی ہوئی نیند میں چلتے ہوئے ہم کدھر جائیں گے"۔ شاعر کی" روئی ہوئی آنکھ سے دنیا بہت صاف دکھائی دیتی "تھی، اب اسے رتھ میں جتا کون دیکھ سکے گا؟ غم آگیں تاثیر اور غنائیت سے بھری نظموں کے سارے لفظ" دل ہی دل میں ہاتھ ہلانے" لگتے ہیں۔

وہی نظمیں جن میں وہ تین زمانوں اور تین پہروں کی دو تکونوں کی تکرار بناتا اور اپنی شہری اور قصباتی زندگیوں اور قصبے سے شہر میں ہجرت کی کہانی سموتا، آواز لگاتا پھرتا تھا،

"ہے کوئی؟ زندہ ہے کوئی؟

جاگا ہے کوئی؟ سنتا ہے کوئی؟"

پھر لفظوں کی پذیرائی کرتا مسیحائی کرنے لگتا۔ وقت کی بے رحمی سے بے خبر بہار کے مہینے میں مجھے کہتا رہا، دیکھو اپنی ماں کی وفات کو کسی طرح ریشنلائز کر لو ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی اور خزاں کے آخری دنوں میں دنیا کی رنگا رنگی سے خالی پن کشید کرتا اور موہوم کی مہک کو نظموں میں قید کرتا شاعر "دیواروں تک ٹھہری نظروں کے آشوب سے باہر" نکل گیا۔ یہ نہیں بتایا کہ اس کے جانے کو کیسے ریشنلائز کرنا ہے۔ ہمارے پاس تو بس 'آخری دن سے پہلے' اور 'موہوم کی مہک' میں درج، وجود کے گرد پھیلی بے ثباتی اور نارسائی کے کہانیاں بچی ہیں۔

"قبروں پر دیے بجھ گئے ہیں

اور

درختوں میں ستارے ٹوٹ رہے ہیں

بوسیدہ کواڑوں پر

خاموشی دستک دیتی ہے

اداسی اور محبت سے بوجھل ہوا

سیٹیاں بجاتی

زمانوں سے گذر رہی ہے
کیلنڈر سے سال دنوں کی طرح اتر رہے ہیں
آنگنوں میں چارپائیاں اوندھی پڑی ہیں
اور چولھوں میں راکھ سرد ہو چکی ہے"

(داستان)

"نشستوں پر گرے پتے بتاتے ہیں" کہ اب وہ کسی کے گھر نہیں جائے گا اور پوچھے گا،

"رات بھر کون تھا ساتھ میرے
وہ تم تو نہیں تھے
وہ تم تو نہ تھے
پھر کسے میں بتاتا رہا
رات بھر
اس جگہ شہر تھا۔"

اب اس کے ساتھ محمد خالد اور سب دھند میں کھو جانے والے "ماچس بجاتے، گیت گاتے دل زدہ ساتھی" ہیں اور ان کے جلو میں ابرار احمد سوچتا ہے کہ کیا یہی وہ دن تھا جس کے بارے میں میں نے کہا تھا کہ "سارے دن۔ میرے اندر غروب ہو جائیں گے" ۔ اور سوچتا ہے "یہ کالک کیوں نہیں جاتی؟" ۔ اور سنتا ہے اپنے بارے اٹھتے سوالوں اور چہ مگوئیوں کو۔ کف افسوس ملتا ہے اور پھر سوچتا ہے کہ اس نے جب سلویا پلاتھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "کاش تم جیتے چلے جانے پر خود کو آمادہ کر سکتیں / اور ہم۔ کم از کم ایک مرتبہ / اس آسمان کے نیچے / ایک دوسرے کو دیکھ سکتے" تو ایک شاعر نے دوسرے شاعر کی شاعری میں ڈوبے ہوئے اس کے بارے یہ نہیں سوچا تھا کہ سلویا کون تھی، اس نے کیسی زندگی چنی تھی اور کیسی موت کو گلے لگایا تھا۔

کچھ پتا نہیں چلتا

ابرار احمد

آبائی شہر کو جاتی گاڑی کو دیکھتا ہوں
اس میں سوار نہیں ہوتا
اور نہ ہی ہاتھ ہلاتا ہوں
دنیا۔
عجیب و غریب لوگوں اور چیزوں سے بھری پڑی ہے

میں بھی بچتا بچاتا ان میں سے گزرتا ہوں
بغیر کسی یاد کے !!!

منصور آفاقی

میں قبریں گنتے گنتے تھک گیا ہوں

منصور آفاقی

روزنامہ جنگ۔۵ نومبر ۲۰۲۱

یوں تو ہر روز لاکھوں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور لاکھوں موت کی تاریک وادی میں اتر جاتے ہیں مگر ہمیں انہی کا دکھ ہوتا ہے جو ہمارے دل کے نزدیک ہوتے ہیں، جن سے کوئی تعلق ہوتا ہے قربت کا پیمانہ ہی اس دکھ میں کمی و بیشی کا سبب بنتا ہے مگر اظہر نیازی کی موت نے ان سب پیمانوں کو جھٹلاتے ہوئے مجھے ہلا دیا ہے۔ اس سے پہلے مجھے انوار حسین حقی کی موت پر بھی اتنی ہی تکلیف ہوئی تھی۔ میرا یہ مسئلہ نہیں اظہر نیازی کون تھا کس کا بیٹا تھا کس خاندان کا فرد تھا، کہاں رہتا تھا، کب پیدا ہوا۔ میرا صرف اتنا مسئلہ ہے۔ پھول اس وقت کیوں مر گیا جب اس کے مہکنے کا وقت آیا تھا۔ جب اس کی خوشبو سے پورا میانوالی معطر ہو رہا تھا۔ یہ دکھ لگتا ہے کافی دیر تک مجھے اداس رکھے گا۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کی وفات بھی بڑا دکھ ہے مگر میں اس کے لئے ذہنی طور تیار تھا۔ وہ کافی عرصے سے بیمار تھے۔ وہ میانوالی کالج میں ہمیں پڑھاتے تھے۔ میں نے اردو ایڈوانس کا مضمون بھی لیا ہوا تھا۔ اس کا ساتواں پیریڈ ہوتا تھا اور میں اکیلا طالب علم۔ سو جیسے ساتواں پیریڈ شروع ہوتا تھا اجمل نیازی مجھے کہتے تھے آؤ چلیں اور ہم دونوں کالج سے نکل پڑتے تھے۔ شہر کے بازار سے کوئی دو کلو میٹر کے فاصلے پر کالج تھا۔ وہاں سے کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر، کبھی تانگے پر بازار پہنچتے اور پھر دو تین گھنٹے کبھی کسی ہوٹل پر، کبھی کسی دوست کی دکان پر بیٹھ کر گپ شپ ہوتی رہتی تھی۔ شہر کے دوسرے شعرائے کرام بھی جمع ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر فیروز شاہ تو ضرور آجاتے تھے۔ تقریباً دو سال ان کے ساتھ اسی طرح گزرے اور پھر ان کا میانوالی کالج سے پیر محل کالج میں تبادلہ ہو گیا۔ وہاں کچھ عرصے رہے۔ وہاں سے پھر تبادلہ کرا کے لاہور آگئے۔ لاہور کینٹ کے کسی کالج میں۔ اس تمام عرصے میں ان کے ساتھ بہت اچھے مراسم رہے۔ 1990 تک محبت کا یہ سلسلہ اپنے عروج پر رہا۔ میں بھی میانوالی سے لاہور آ گیا تو پھر اس تعلق میں کمی آتی گئی یقیناً اس میں زیادہ قصور وار میں ہی ہونگا بہر حال میرے دل میں ان کے لئے ایک احترام ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اللہ تعالی انہیں جنت افردوس میں جگہ عطا کرے۔

مجھے ڈاکٹر ابرار احمد کی موت کا بھی دکھ ہے۔ وہ نظم کے بہت ہی عمدہ شاعر تھے۔ ان سے زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوئیں مگر میں ان کی نظم

سے بہت ملتا رہاہوں۔ اس سے برسوں میری ہمکلامی رہی۔ ان کی نظم کے ساتھ پھر تھوڑی سی گفتگو کرلیتے ہیں۔"میرے پاس راتوں کی تاریکی میں۔ کھلنے والے پھول ہیں۔اور بے خوابی۔دنوں کی مرجھائی ہوئی روشنی ہے۔اور بینائی۔میرے پاس لوٹ جانے کو۔ایک ماضی ہے۔اور یاد۔میرے پاس مصروفیت کی تمام ترر نگارنگی ہے۔اور بے معنویت۔اور ان سب سے پرے کھلنے والی آنکھ۔میں آسماں کو اوڑھ کر چلتا۔اور زمین کو بچھونا کرتا ہوں۔جہاں میں ہوں۔وہاں ابدیت اپنی گرہیں کھولتی ہے۔جنگل جھومتے ہیں۔بادل برستے ہیں مور ناچتے ہیں۔میرے سینے میں ایک سمندر نے پناہ لے رکھی ہے۔میں اپنی آگ میں جلتا۔اپنی بارشوں میں نہاتا ہوں۔میری آواز میں۔بہت سی آوازوں نے گھر کرر کھا ہے۔اور میر الباس۔بہت سی دھجیوں کو جوڑ کر تیار کیا گیا ہے۔میری آنکھوں میں۔ایک گرتے ہوئے شہر کا سارا ملبہ ہے۔اور ایک مستقل انتظار۔اور آنسو۔اور ان آنسوؤں سے پھول کھلتے ہیں۔تالاب بنتے ہیں۔جن میں پرندے نہاتے ہیں۔ہنستے اور خواب دیکھتے ہیں۔میرے پاس۔دنیا کو سنانے کے لئے کچھ گیت ہیں۔اور بتانے کے لئے کچھ باتیں۔میں رد کئے جانے کی لذت سے آشنا ہوں۔اور پذیرائی کی دل نشیں مسکراہٹ سے۔بھر ارہتا ہوں۔میرے پاس۔ایک عاشق کی وارفتگی۔درگزر اور بے نیازی ہے۔تمہاری اس دنیا میں۔میرے پاس کیا کچھ نہیں ہے۔وقت اور تم پر اختیار کے سوا؟"۔بے شک ڈاکٹر ابرار احمد وقت پر اختیار رکھتے ہیں۔وہ مر چکے ہیں مگر ان کی نظم زندہ ہے۔جاوید انور کی موت پر میں نے لکھا تھا کہ "نظم مر گئی ہے" اس کی چند لائنیں بھی یاد آرہی ہیں۔"رک گئیں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں۔دھڑکنیں حرف کی۔لفظ مردہ ہوئے۔سو گئیں جاگتی گھنٹیاں چرچ کی۔اک اسپیکر سے اٹھتی اذاں گر پڑی۔ایک بہتا ہوا گیت جم سا گیا۔مر گئی نظم۔قوسِ قزح پہ مچلتی ہوئی۔دور تک سرد سورج کی کالی چِتا۔دور تک۔راکھ چہرے پہ مل مل کے آتی ہوئی۔ایڑیوں سے اندھیرے اڑاتی ہوئی۔کچھ نہیں چار سو۔تیرگی سے بھری دھول ہی دھول ہے۔موت کے فلسفے کے شبستان میں۔اک سدھارتھ صفت سو گیا خاک پر۔رنگ پتھرا گئے۔کرچیاں ہو گئیں بوتلیں خواب کی بہہ گئی ارمغانِ حرم دشت میں۔ناگاساکی سے میت اٹھی خیر کی۔صبحِ عیسیٰ سے شام اپنی۔خالی ہوئی۔ہوچی منہ سے نیام اپنی خالی ہوئی۔گرپڑا لورکا بھی۔کلائی سے باندھا ہوا۔ساڑھے لینن بجے کے بجے رہ گئے"۔ابرار احمد کی طرح جاوید انور بھی نظم کا بہت اہم شاعر ہے۔اس کی نظم بھی زندہ وجاوید ہے۔جاوید انور اور ڈاکٹر ابرار احمد جیسے لوگ جن لفظوں کو چھولیں وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتے۔

عمر شریف کی موت پر بھی میں نے نوحہ لکھنا تھا۔ہائے کیا چیز تھی جو ہم سب سے بچھڑ گئی۔ایک قہقہہ قبر کی مٹی میں اتر گیا۔ایک مسکراہٹ لوحِ مزار بن گئی اور بھی کئی نوحے ہیں جو ابھی مجھ پر قرض ہیں۔لگتا ہے ان میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔سید نصیر شاہ نے کہا تھا

اجل کی زد پہ ہے میرا قبیلہ
میں قبریں گنتے گنتے تھک گیا ہوں

وجاہت مسعود

ابرار احمد: قصباتی لڑکا واپس چلا گیا

وجاہت مسعود

روزنامہ جنگ۔۸ نومبر ۲۰۲۱

عدم اور وجود کے کھیل سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ موت وہ فسطائی فرمان ہے جو مکالمے کا روادار نہیں۔ نامعلوم کی نیند کے ایک لامتناہی سلسلے میں بیداری اور غفلت کے جلتے بجھتے روز و شب کا ایک مختصر وقفہ، فرد کی زندگی یہی ہے۔ گزشتہ نسل جگہ خالی کرے گی تو زمین آئندگان کو خوش آمدید کہہ سکے گی۔ یہ سب درویش کو بھی اسی طرح معلوم ہے جیسے آپ کو۔ تو پھر چند برسوں سے یہ احساس کیوں ہو رہا ہے گویا مہربان آنکھوں اور مانوس آوازوں کا گولہ گنڈا وقت کے سرکنڈے پر پھسلتا ہوا تپتی ہوئی ریت پر جا گرا ہے، برفانی ذروں کے رنگ ایک ایک کر کے معدوم ہو رہے ہیں اور بس اتنی ہی جگہ گیلی ہو پائی ہے، جتنی ایک دوست کے لئے بہتے آنسوؤں سے نمدار ہو سکتی تھی۔ تسلیم کہ کوویڈ کی وبا کو اب قریب تین برس ہونے کو آئے ہیں مگر جنگ، آفات اور وبائیں تو انسانی تاریخ میں ساتھ ساتھ چلی ہیں۔ اس میں انہونی کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے۔ تو چلئے مان لیتے ہیں کہ ہر نسل کی مدت عمر میں ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جب اسے یکے بعد دیگرے دوستوں کے اوجھل ہونے سے احساس ہوتا ہے کہ ہماری مہلت ختم ہونے کو ہے۔ ہونے اور نہ ہونے کے اس وقفہ تذبذب میں آگے نکل جانے والوں کو احترام دینا ہو گا۔ اس کا ایک ممکنہ ڈھنگ یہ ہو سکتا ہے کہ رفتگاں کے چھوڑے ہوئے تخلیقی نقوش کی معنویت بیان کی جائے۔

29 اکتوبر کو ابرار احمد اپنے حلقہ شعر کے ساتھیوں علی افتخار جعفری اور محمد خالد سے جا ملے۔ ستر کی دہائی میں لاہور سے اٹھنے والی غزل اور نظم کا ایک باب مکمل ہو گیا۔ اس فہرست میں جاوید انور کو بھی شامل ہونا چاہیے تھا مگر زمانی حدوں میں ہم آہنگی کے باوجود جاوید انور کے بیرون ملک قیام سے ایک مکانی بعد آ گیا تھا۔ ابرار احمد کون تھا؟ 6 فروری 1954 کو جرانوالہ کے قصبے میں پیدا ہونے والے ابرار احمد نے ستر کی دہائی کے آخری برسوں میں اردو نظم سے آشنائی کی تھی۔ نظموں کا مجموعہ 'آخری دن سے پہلے' 1997ء میں شائع ہوا۔ غزل کا اثاثہ 'غفلت کے برابر' کے عنوان سے 2007 میں شائع ہوا۔ دیکھئے، میرا ایک مسئلہ ہے۔ میں ادب کی فلسفیانہ اور مجرد تفسیر میں یقین نہیں رکھتا۔ اگر شاعر کو اپنی رسائی کے لئے میری کج مج بیانی ہی کی احتیاج تھی تو اس نے شعر کیوں کہا، خود بیٹھ کے 'نیند اور غفلت میں مابعد نو آبادیاتی جبر' جیسے عنوان سے تفلسف آرائی کر لیتا۔ اس سے کہیں بہتر ہو گا کہ میں آپ کو اپنے دوست کی بہترین نظموں میں سے ایک نظم 'قصباتی لڑکوں کا گیت' کا ایک ٹکڑا سناؤں۔

ہم لوٹیں گے تیری جانب
اور دیکھیں گے تیری بوڑھی اینٹوں کو
عمروں کے رت جگوں سے دکھتی آنکھوں کے ساتھ
اونچے نیچے مکانوں میں گھرے
گزشتہ کے گڑھے میں
ایک بار پھر گرنے کے لیے
لمبی تان کر سونے کے لیے
ہم آئیں گے تیرے مضافات میں
مٹی ہونے کے لئے

2012ء میں ڈاکٹر ابرار احمد نے حلقہ ارباب ذوق کے سالانہ اجلاس میں خطبہ پیش کیا تھا۔ اس شام ابرار احمد ادب اور اپنے عصر کی تفہیم کے بیان میں بہت سی منزلیں عبور کر گیا تھا۔ دونوں بازو روسٹرم پر رکھے وہ دہشت کے موسم میں لفظ اور اظہار کے کردار پر کسی گیانی استاد کی طرح روشنی ڈال رہا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق اب اسی برس کا ہونے کو آیا ہے۔ جہاں اس ادارے نے ادب کی بے پناہ خدمت کی ہے، اس کی ایک روایت ہم عصرانہ چشمک بھی رہی ہے۔ 2012ء کی اس شام بھی اس قسم کے کچھ اشارے دیکھنے میں آئے۔ درویش ادب میں گروہ بندیوں کا قائل نہیں۔ لکھے ہوئے لفظ میں توانائی ہے تو وہ فکری اور گروہی حد بندیاں پار کر کے پڑھنے والے تک پہنچے گا۔ اس شام حلقے کی انتخابی سیاست سے پھوٹنے والی شکر رنجی کو ادب کی اقلیم میں دراندازی کرتے دیکھا تو میں آزردہ ہوا۔ شاعری کا تو کوئی دعویٰ نہیں البتہ دوستی کے اپنے بناؤ بگاڑ ہوتے ہیں۔ اس شام ایک متشاعر نے ابرار احمد سے اپنی محبت کو 'مکان اور ستارے میں پرواز کی تیکنیکی دشواریاں' کے عنوان سے ایک نظم کی صورت میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ ایک ٹکڑا دیکھیے:

ابرار احمد!
ہمیشہ دو نقطوں کے درمیان
بغیر رکے اڑتے رہنے سے تھکن طاری ہو جاتی ہے
اگر چاہو تو میری ہتھیلی پر آن اترو
میں تمہارے سینے کی حرارت محسوس کرنا چاہتا ہوں

ابرار احمد میری ہتھیلی پر اترنے کی بجائے 'اپنے قصبے کے مضافات میں مٹی ہونے کے لئے' چلے گئے۔ قصباتی لڑکے دنیا بھر میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے باوجود اونچے نیچے مکانوں کی بوڑھی اینٹوں سے کیا ہوا وعدہ نہیں بھولتے۔

نصیر احمد ناصر

"اور یہ دوستی رہے گی ابھی"

از قلم نصیر احمد ناصر (نصیر احمد ناصر کی فیس بُک وال سے)
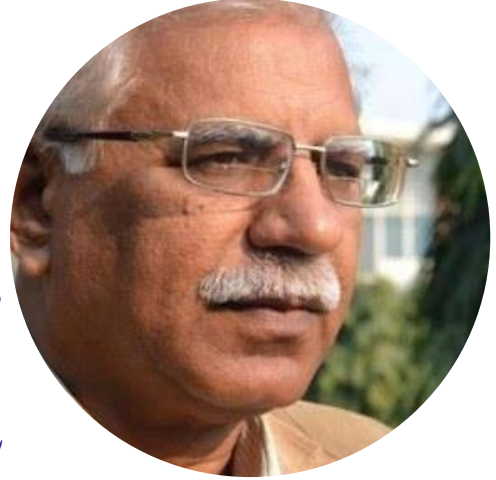
دکھ اور آنسوؤں کا کوئی موسم نہیں ہوتا، کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔ "اور یہ دوستی رہے گی ابھی" کہنے والا دیرینہ ادبی ساتھی ابرار احمد اچانک دوستی توڑ کر چلا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! آخری بار جب فون پہ بات ہوئی تو ڈیپریشن سے بھری آواز میں کہنے لگا "یار اس بار صحت (جگر) کا معاملہ کافی سیریس ہے، دعا کرنا۔" لیکن یہ تو گمان میں بھی نہیں تھا اور یقین ہی نہیں آتا کہ اتنی جلدی ساتھ چھوڑ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ابرار کی مغفرت فرمائے اور ابدی رحمت و سکون سے نوازے۔ آمین!

ابرار احمد کے لیے لکھی گئی کئی سال پہلے کی ایک تحریر جس کے جواب میں ابرار نے لکھا: 'اور یہ دوستی رہے گی ابھی' (ابرار احمد)

دوستو! میری اور ابرار احمد کی دوستی اتنی پرانی ہے جتنی ہماری نظمیں۔ ہماری عمریں بھی تقریباً برابر ہیں۔ دونوں اِس سال کسی بھی وقت "سٹھ جائیں" گے۔ مونچھوں کا سائز بھی کم و بیش ایک جتنا ہے۔ صرف بالوں کے رنگ کا فرق ہے۔ لیکن وہ فرق ظاہری ہے، اصل میں تو ہم دونوں ہی کے بال سفید ہیں۔ ابرار انہیں اسودی کر لینے میں ماہر ہے، میں انہیں مزید سفید کر لیتا ہوں۔ ہمارا شعری سفر بھی تقریباً ایک ساتھ شروع ہوا۔ مجھے ابرار کی نظمیں شروع ہی سے غیر مشروط طور پر پسند رہی ہیں۔ اتنی پسند کہ اس کے لیے مجھے کبھی اظہار کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ ویسے تو ہم پتا نہیں کہاں کہاں شائع ہوتے رہے، شاید ہی کوئی جریدہ ایسا ہو جو ہماری دسترس سے بچا ہو، لیکن 'اوراق' وہ رسالہ ہوتا تھا جہاں ہم 'بصد انتظار' ایک دوسرے کی نظمیں پڑھ کر اپنی اپنی اداسیاں شیئر کیا کرتے تھے۔ میرے خیال میں شاعری چند بحور و اوزان اور الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ چیزِ دیگر ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ چیزِ دیگر یعنی شاعری ابرار کی نظموں میں اتنی وافر ہے کہ جس کو کہیں سے نہ ملے وہ ابرار کی نظموں کو پڑھ لے اور 'بقدرِ توفیق' حاصل کر لے۔ اور تو اور ابرار کی نثری نظموں میں بھی شعری عناصر اور شعریت کی اتنی فراوانی ہے جو بیشتر آزاد، معریٰ اور پابند نظم لکھنے والوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ ابرار کی نثری نظمیں پڑھنے والا ایسے شعری ردھم میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ عروضی ردھم کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں جاتا۔ بلاشبہ ابرار احمد کی نظم شعری اور جمالیاتی حسیات کی عمدہ مثال ہے۔

ابرار کی کچھ ایسی خوبیوں کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے جو ہم میں مشترک نہیں اور وہ ہیں تنقید، بحث مباحثہ اور ادبی سیاست و صحافت۔ ابرار ایک عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی مباحث و سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا ایک بامطالعہ نقاد اور ادبی کالم نگار بھی ہے۔

لیکن ابرار ان ادیبوں اور شاعروں کی طرح نہیں جو کالم نگار بن کر ادب کی ''بے ادبی'' شروع کر دیتے ہیں۔ ابرار کی ادبی صحافت اور سیاست کی اساس حقیقی ادبی اقدار اور نقد و نظر کا مطالعاتی پھیلاؤ اور سبھاؤ ہے۔ یہ صلاحیت بہت کم شاعروں میں ہوتی ہے۔ مجھ میں تو بالکل نہیں۔ اس لحاظ سے ابرار کا پلہ بھاری ہے۔ تاہم شکر ہے کہ اس نے اپنی اِس صلاحیت کو ابھی تک مجھ پر نہیں آزمایا اور میری یہ خوش فہمی بر قرار ہے کہ ابرار کو بھی میری شاعری اسی طرح پسند ہے جس طرح مجھے اُس کی۔ دراصل ابرار اور میں جس شعری لینڈ اسکیپ اور جن تخلیقی منطقوں کے شاعر ہیں اُن میں باہمی تنقید و توصیف کی بجائے تخلیقی اعتراف و اعتبار زیادہ اہم ہے۔ یہ وہ تعلق ہے جس میں تخلیقی اثبات باہمی توصیف و تنقید سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ابرار احمد بھی ہمیں چھوڑ گئے

ظفر اقبال

روزنامہ دُنیا ۱۳۱ اکتوبر ۲۰۲۱

ظفر اقبال

سب کچھ یہیں پڑا رہ جاتا ہے اور آدمی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارا بے مثل شاعر بھی ہاتھ سے نکل گیا اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ نہیں مر، میں مر گیا ہوں کیونکہ میں نے اسے کبھی اپنے سے الگ نہیں سمجھا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ دُکھ کی اس گھڑی میں مرحوم پر لکھا بھی نہیں جا رہا اور میں اسے زندہ مرحوم کہوں گا۔ اس لیے بھی کہ اس کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس نے ایک طویل علالت بھگتی، خود ڈاکٹر ہونے کے باوجود جسم میں ہونے والی تبدیلیوں سے بروقت آگاہ نہ ہو سکا، ہوا بھی تو اس وقت جب ناقابلِ تلافی نقصان ہو چکا تھا اور ہزار کوشش کے باوجود کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں ہر ہفتے بڑے فخر اور چاؤ سے اپنے کالم میں اس کی نظم چھاپتا رہا ہوں۔ اس نے مجھے کئی بار روکا بھی کہ اس امتیازی سلوک پر کچھ لوگ معترض بھی ہیں لیکن میں ان نظموں سے قارئین کو محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا؛ چنانچہ جہاں میری غزل ہر ہفتے شائع ہوتی، اس سے اگلے روز اس کی نظم اپنے جلوے بکھیر رہی ہوتی۔ اس کی آزاد نظمیں تو لاجواب ہیں ہی، اسکی نثری نظمیں بھی مجھے حیران کر دیتی ہیں۔ نذیر قیصر کے بقول شعر وہ ہوتا ہے جو آپ کو حیرت زدہ کر دے۔ وہ اتنی زوردار ہوتیں کہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ایک زبردست نثار بھی تھا۔ نثری نظم ویسے بھی زورِ بیان کو تقاضا کرتی ہے کیونکہ اس کے ساتھ موزونیت کا دُم چھلا نہیں لگا ہوتا اور ایسے لگتا ہے کہ نظم گو نہیں، یہ کوئی فکشن رائٹر ہے جو اپنے کمالات دکھا رہا ہے۔

اب اس سے آگے نہیں لکھا جارہا اس لیے اسکی کچھ نظموں سے اپنے دیدہ و دل روشن کیجیے:

چہل قدمی کرتے ہوئے۔۔۔

کہیں کوئی بستی ہے
خودرو جھاڑیوں اور پھولوں سے بھری
جہاں بارش
بے آرام نہیں کرتی
چھینٹے نہیں اُڑاتی
صرف مہکتی ہے۔۔۔۔
مٹی سے لپے گھروں میں
ہوا شور کرتی
آوازیں سوئی رہتی ہیں
کوئی سرسراہٹوں بھرا جنگل ہے
پگڈنڈیوں اور درختوں کے درمیان
انجان پانیوں کی جانب نہریں بہتی ہیں
اور راستے کہیں نہیں جاتے
پرندوں کی چہکاریں، لامتناہی عرصے کے لیے
پتّوں کو مرتعش کر دیتی ہیں
دنیا سے الگ
کہیں ایک باغ ہے
غیر حتمی دوری پر
سیاہ گلابوں اور ابد کی مہک میں سویا
کہیں کوئی آواز ہے
نے نہایت چُپ کے عقب میں
بے خال و خد، الوہی، گمبھیر
کہیں کوئی دن ہے
بے اعتنائی میں لتھڑا ہوا
اور کوئی رات ہے
اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں کے ہمراہ
جس میں مجھے داخل ہو جانا ہے
یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے
اور بجھے آتش دان کے پاس
بیٹھ جانا ہے
تمہارے مرجھائے چہرے کی چاندنی میں
کسی مٹیالی دیوار سے
ٹیک لگا کر۔۔۔۔

بات تو ایک ہی ہے

آہستہ چلیں یا تیز
ایک بار ہی آنسو بہادیں
یا انہیں اپنے اندر جمع رکھیں
ڈھیروں باتیں کریں
یا چُپ کی دھول میں لپٹے رہیں
اجلے لباس پہنیں
یس موسموں کی چادر اوڑھے رہیں
خاک کی طرح بیٹھ رہیں
یا اونچی ہواؤں میں اُڑتے پھریں
دیوار کے ساتھ لگے رہیں
یا در در کی ٹھوکریں کھائیں
بات تو ایک ہی ہے
بارشوں میں نہائیں
یا دھوپ میں سوکتھے پھریں
میٹھی نیند سوئیں
یا عمر بر کارت جگا منائیں
اُسے دیکھیں
یا اس سے بے نیاز ہو جائیں
محبت کریں
یا ایک فضول نفرت کے ہم راہ
زندگی سے گزریں

بات تو ایک ہی ہے
رومان بھری اداسی
یا پر تشدد اکتاہٹ
خود فریبی کے پھول
یا سچائی کی ضربیں
بچپن کے جھولے
یا پختہ عمر کے جھٹکے
آہستہ خرام سفر
یا راستوں کو ادھیڑتے ہوئے
سموں کا شور
اضمحلال اور اندھیرا اگرنے کی رفتار تو ایک سی رہتی ہے
جہاں بالآخر ہمیں پہنچنا ہے
ہم نہ بھی چاہیں
تو ایک دن پہنچا دیئے جائیں گے!

ڈاکٹر ابرار احمد

بہت دیر لگا دی تم نے۔۔۔

اس سے ملنا تھا بہت دیر لگا دی تم نے
اے مری عمر!
بہت دیر لگا دی تم نے...
میں نے سوچا تھا کہ اس کارگہ ہستی میں
چند سانس اپنی فراغت کے گھنے سائے میں
کھینچ پاؤں تو اسی سمت چلا جاؤں گا
میں نے سوچا تھا کہ اس موڑ تلک جاؤں گا
جس سے رستے، ابدیت کی طرف مڑتے ہیں
اور موجود کی ذلّت سے پرے
دشت امکاں میں
درختوں سے لپٹ جاؤں گا
اپنے دن رات کے لفظوں کی کھلی بارش میں
بھیگ جاؤں گا،
اسی نام کے سائے سائے
چلتا جاؤں گا بہت دور تلک
وقت روٹھا ہوا بچہ ہے
منا لوں گا
تونے اے عمر!
سنبھلنے نہ دیا
اپنی غفلت کی تھکاوٹ سے نکلنے نہ دیا
خواب کے بیچ، جو اک اسم کا دروازہ تھا
کھولتے کھولتے ہر سانس گنوا دی میں نے
اے مری عمر.....
بہت دیر لگا دی تم نے....

بہت یاد آتے ہیں

چھوٹے ہو جانے والے کپڑے،
فراموش کردہ تعلق
اور پرانی چوٹوں کے نشان
اولین قرب کی سرشاری
سرد راتوں میں ٹھٹھرتے ہوئے، پتیلے میدان
پہلے پہل کی چاندنی میں
ڈھولک کی سنگت میں گائے ہوئے کچھ گیت
اور نیم تاریک رہداریوں میں جگمگاتے لمس

دوستوں کی ڈینگیں
فراغت اور قہقہوں سے لدی کرسیاں
کھیل کے میدان
تنور پر پانی کا چھڑکاؤ
گندم کی خوشبو اور مہربان آنکھیں
بہت یاد آتے ہیں
دسویں کے تعزیے
مٹی اور عرق گلاب سے مہکے سیاہ لباس
مستقبل کے دھندلے خاکے
رخصت کی ماتمی شام
کہیں کہیں جلتے اداس لیمپ
سر پٹختی ہوا میں ہلتے ہوئے
اور رات کی بھاری خامشی میں دور ہوتی ہوئی ٹاپوں کی آواز
بہت یاد آتے ہیں
بڑھے ہوئے بال
منکوں کی مالا
سرمنڈل کی تان
پرانی کتابیں
وقت بے وقت کیے ہوئے غلط فیصلے
پہلے سفر کی صعوبت
دریا کے پل پر پھنسی ٹریفک اور ریل کی سیٹی
وادی کا سینہ چیرتی ہوئی
کچھ مکان اور دروازے
اور جب یہ دروازے بند ہوئے

آہستہ آہستہ اترتے ہوئے اضمحلال کی دھند میں
بہت یاد آتے ہیں
دور کے آسمان اور پرندے
ایک ان دیکھی دنیا
اور اس پر بنا ہوا عشق پیچاں کی بیلوں میں لپٹا ہوا
چھوٹی سرخ اینٹوں والا گھر
آتش دان کے پاس کیتلی سے اٹھتی بھاپ
چمپی مخروطی انگلیاں
مضراب کو چھیڑتی ہوئیں.
ایک روشن جسم آنکھیں ملتا ہوا
یادوں اور خوابوں کے یہ چھوٹے چھوٹے دیے
جلتے اور بجھتے رہتے ہیں
بجھتے اور جلتے رہتے ہیں
اس روشنیوں بھرے شہر کی سرد مہر، تاریک رات میں!!!

غزل

بَہ رنگ بُوئے پریشاں, یہاں وہاں ہو گا
تو میرے پاس ہی ہو گا مگر کہاں ہو گا

دَمِ وصال جو ہے رنگِ عالمِ دُنیا
بچھڑتے وقت بھی شاید یہی سماں ہو گا

وہ راستہ ابھی بھولا نہیں ہے ، سو یہ فقیر
تُو جب کہے, تری جانب رَواں دواں ہو گا

یہاں سے اب ہمیں کچھ بھی سُجھائی دیتا نہیں
اگر یہ اَبر نہیں ہے تو پھر دُھواں ہو گا

اب ایسے عالمِ تنہائی میں یہ کیا دیکھیں
کہ تُو نہیں تو کوئی دوسرا کہاں ہو گا

کہیں پہ ہیں کہ نہیں ہم ، یہ کیا سوال ہُوا؟
تمہیں یقین نہیں ہے تو پھر گماں ہو گا

نہیں کہیں پہ بھی یک جائی کی کوئی صورت
ہم ایک ہو بھی گئے کوئی درمیاں ہو گا

میں خوابِ ہجر سے جاگا تو ڈھونڈھ لوں گا تجھے
تو اس نواح میں ہوگا مگر کہاں ہو گا

کہ اب جو مجھ میں شباہت کی چھوٹ پڑتی ہے
یہ میں نہیں ہوں کوئی رنگِ رفتگاں ہو گا

(اَبرار احمد)

غزل

راہ دشوار بھی ہے، بے سر و سامانی بھی
اور اس دل کو ہے ، کچھ اور پریشانی بھی

یہ جو منظر ترے آگے سے سرکتا ہی نہیں
اس میں شامل ہے تری آنکھ کی حیرانی بھی

صرف افسوس کا سایہ ہی نہیں ہے ہم پر
ہم کہ ہیں خواب تب و تاب کے زندانی بھی

اپنے مجبور پہ کچھ اور کرم ہو کہ اسے
کم پڑی جاتی ہے اب غم کی فراوانی بھی

رہ تری چھوڑ کے کیوں جانب دنیا آئے
ہم کو جینے نہیں دیتی یہ پشیمانی بھی

بے نیازی کی وہ خو جیسے کبھی تھی ہی نہیں
خواب تھے جیسے وہ ایام تن آسانی بھی

(ابرار احمد)

غزل

ہم نے رکھا تھا جسے ،اپنی کہانی میں کہیں
اب وہ تحریر ہے اوراق خزانی میں کہیں
بس یہ اک ساعت ہجراں ہے کہ جاتی ہی نہیں
کوئی ٹھہرا بھی ہے اس عالمِ فانی میں کہیں
جتنا ساماں بھی اکٹھا کیا ،اس گھر کے لیے
بھول جائیں گے اسے نقلِ مکانی میں کہیں
خیر اوروں کا تو کیا ذکر کہ اب لگتا ہے
تو بھی شامل ہے مرے رنج زمانی میں کہیں
چشم نمناک کو اس درجہ حقارت سے نہ دیکھ
تجھ کو مل جانا ہے اک دن اسی پانی میں کہیں
مرکز جاں تو وہی تو ہے ،مگر تیرے سوا
لوگ ہیں اور بھی اس یاد پرانی میں کہیں
جشن ماتم بھی ہے رونق سی تماشائی کو
کوئی نغمہ بھی ہے اس مرثیہ خانی میں کہیں
آج کے دن میں کسی اور ہی دن کی ہے جھلک
شام ہی اور ہے اس شام سہانی میں کہیں
کیا سمجھ آئے کسی کو مجھے معلوم بھی ہے
بات کر جاتا ہوں میں اپنی روانی میں کہیں

ابراراحمد

غزل

کہ جیسے کنج چمن سے صبا نکلتی ہے
ترے لیے میرے دل سے دعا نکلتی ہے
قدم بڑھاؤں تری رہ گزر ہے آخر
مگر یہ راہ کہیں اور جا نکلتی ہے
یہیں کہیں پہ ہے رستہ دوامِ وصل کا بھی
یہیں کہیں سے ہی راہ فنا نکلتی ہے
ضرور ہوتا ہے رنج سفر مسافت میں
کہ جیسے چلنے سے آواز پا نکلتی ہے
یہاں وہاں کسی چہرے میں ڈھونڈتے ہیں تمہیں
ہمارے ملنے کی صورت بھی کیا نکلتی ہے
ہر ایک آنکھ میں ہوتی ہے منتظر کوئی آنکھ
ہر ایک دل میں کہیں کچھ جگہ نکلتی ہے
جو ہو سکے تو سنو زخمۂ خموشی کو
کہ اس سے کھوئے ہوؤں کی صدا نکلتی ہے
ہم اپنی راہ پکڑتے ہیں ، دیکھتے بھی نہیں
کہ کس ڈگر پہ یہ خلق خدا نکلتی ہے

ابراراحمد

Nasir Abbas Nayyar

A poet extraordinaire

Dr Abrar Ahmad lives on in his poetry
(The News – November 7, 2021)

سو چکا تھا تہ خاک میں جس گھڑی
میرے اندر کوئی جاگتا رہ گیا

- Abrar Ahmad

It is the poetry that is most at risk in the act of a translation of poetry. What the sh'er quoted above intends to convey can be said in English language but the overall semantic ambience around these two fairly small lines is hard to reproduce. The meaning(s) of the phrases Tah-i-khak so chuka tha and Koi andar jaagta reh gia are not entirely located in their literal sphere, not even in and around their metaphorical realms as besides literal and metaphorical realms, meanings of poetry are to be found in its cultural-symbolic ambience, in the very act of reading and the moment of reading.

The sh'er had different meanings a few days ago before the passing of its author, Abrar Ahmad. But while the world of Urdu literature mourns his demise – which was somewhat anticipated as his cancer was known to be at terminal stage – this sh'er takes on a different meaning. It can now be interpreted like this: though Ahmad has become eternally silent in the darkness of his grave, his poetry on paper and screen is

alive, speaking, uninterrupted, in an unusual loud tone. Poets – like all mortals – are condemned to death but their poetry is blessed to live on.

Born on February 6, 1954, at Jaranwala, Ahmad completed his school education from Al-Islah High School, Chiniot. His father, Mian Gulzar Ahmad, had no formal education and was a goldsmith by profession. However, he was a connoisseur of Urdu poetry and music. He was fond of listening to Urdu mushairas broadcast on Radio Pakistan. Speaking of his marvellous taste in poetry and music, Ahmad said he had inherited and learned much from his father. In 1969, he enrolled as an intermediate student at the Government College (GC). A science student, he was inspired by the literary and co-curricular activities at the college. During his stay at Iqbal Hostel at GC, he edited its literary magazine, Iqbal, which carried his first nazm. Dr Muhammad Ajmal, distinguished psychologist and the then principal of the college advised him not to pursue the medical profession. Acquiescing, Ahmad secured admission in BA but on the insistence of an uncle, later changed his decision.

His next destination was Nishtar Medical College, Multan. In 1979, he completed his MBBS degree. During his stay at Multan, he developed long-lasting personal and literary relations with the literati of the city. It was also there that he developed an interest in existentialist writers of the West. For the next two years he served in the Pakistan Army. The stint was then incumbent on all medical graduates. He spent a few years in Rawalpindi where he actively took part in literary activities. In 1988, he shifted to Lahore. He joined the Services Hospital in 2000 and served there till his retirement in 2014. The highly demanding profession did not noticeably inhibit his passion for poetry and literary activities. He would ardently attend weekly sessions of the Halqa-i-Arbab-i-Zauq, Lahore. His attachment to the Halqa was not without reasons. Since its inception in the late 1930s the Halqa has been a supporter of modernism and Jadid Urdu Nazm. The notion of modernism, the Halqa has embraced since its early days, has been fluid and open to emerging ideas and philosophies. From psychoanalysis to archetypal symbolism to existentialism to post-modernism, it has never compromised on the aesthetics. Insistence on the literariness of poetry and fiction has been a quintessential ingredient in the epistemology of Halqa's ideology. The poetics we perceive underlying the nazm and ghazal of Ahmad are closely related to that of the Halqa's. Ahmad published a book of ghazals titled Ghaflat Kay Barabar in 2007. However, nazm – both free verse and prose – had been his real forte all along. Muhammad Khalid, himself a brilliant poet of Nai Urdu Ghazal and an active member of the Halqa, remained his life-long friend and mentor. Last year Khalid died of Covid-19. His death literally shattered Ahmad.

Ahmed began regularly writing poetry and getting published in literary magazines in the late seventies. He took twenty years to publish get his first book of nazm. His debut Akhari Din Say Pehlay (Before the Last Day) was released in 1997. Ahmad Javaid wrote the preface that aimed at contextualising Ahmad's poetry in the resistance to Gen Zia-ul-Haq's martial law on one hand, and in post Lisani Tashkeelat (linguistic formulations) movement of the Urdu nazm on the other. Javaid declared in unambiguous terms that Ahmad was an existentialist poet, suffering from alienation and loneliness. He quoted French existentialist novelist Albert Camus who famously asked why we are here, all of us, condemned to death – a fundamental question about human existence that seeks to negotiate a way forward in an indifferent yet perishable world. The resonance of this question can be felt in several poems by Ahmad. For instance, the opening poem of the book titled Teri Duniya kay Naqshay Mein (In the Map of Your World), the poet complains to his Creator (here he follows Ghalib who prefers to open his Divan by complaining to God

instead of writing a eulogy) about where in the grand map of His world can he lodge. The question obviously stemmed from a kind of absurdity all existentialists are destined to experience in one way or another. In the introduction to his second book Ghaflat kay Barabar, Ahmad reveals some of his ideas about life, poetry and poetic forms. He makes some well-argued assertions that echo across his poetry too. He asserts

that poetry is his way of life. The reason for this being the case, however, remains elusive. As a way of life, poetry doesn't afford one permanent relief from the life's miseries and sufferings. Poetry, as a way of life, is essentially yet paradoxically directionless, Ahmad claims. Ahmad maintains that poetry is an accountable undirected wandering. This way poetry provided him room for the absurdities and paradoxes of life. Not only were Ahmad's views on poetry modern/existentialist and contrary to progressive ideology, his poetry too is awash with themes of loneliness and irrationality sprouting from absurdity, displacement, quest for identity and the search for meaning in daily experiences. All these themes are intertwined. When you find no permanent place in the map of the world created by a powerful elite or by destiny, you are bound to experience loneliness and displacement.

Aur hi khak ho shaid jo
pata batlaiy
Ham keh is loh-i-jahan say
to mittay howay hen

[There might be another planet
which can guide us to our home/ We have been erased from this plank of universe]

That is why he dedicated his debut book to the old qasba (village) where he had spent his childhood. Addressing his birthplace in his poem Qasbati Larkon ka Geet (A song of small town boys) he says sadly, a day will come when I shall come to see the old bricks and to get myself mouldered near you.

Besides nazm and ghazal, he wrote, though occasionally, prose in Urdu and English. His essays on Urdu ghazal, prose poems and resistance literature were widely read. A few of those were hotly debated. For a few years he had been contributing weekly columns about contemporary Urdu literature to The News on Sunday (TNS). I hope that his friends like Nasir Ali or his younger brother Afzaal Navaid, himself a notable poet of Urdu ghazal, will come forward and compile his Urdu and English writings. His literary career spans over more than four decades, but he published only three books of poetry. He avoided printing most of what he wrote. He believed that a writer must keep evaluating his works. Mauhoom ki Mahek (Fragrance of phantasm) was his third and last book of nazm published two years ago. It was my privilege to review it for TNS. It would not be impertinent to quote a few lines from that review as his third book, too, is replete with the theme of displacement and its attendant overtones.

“It is true that the memories of the past keep haunting him and he comes to know that these memories are the only things that can be termed a treasure in the whole scheme of things. Yet he knows that the past cannot take the place of the present; like other modern poets, he too is compelled to bear the fomentation of the inferno of his times. Sairbeen and Bahut Kam Hae Umr-i-Rawan, two of the longer poems in the collection delineate the characteristics of the inferno where people of the 21st Century are bound to breathe. In these poems, the personal seems to be metamorphosing into political. However, narrating small yet powerful experiences tinged with a subjective approach is what can be called the poet’s forte. Sara ki Potli needs a special mention. The things, places, people, texts that touched his heart appear in his poem nostalgically.” (TNS, June 9, 2019)

How terrible is the reality – and what a paradox it is that all displaced people desire keenly to go back to their birthplaces, but are destined to inhabit the eternal abode. Ahmad has left us but lives on in our memories. Memories of a person might vanish or perish with the passage of time, but a memory built up by creative work survives the ravages of time.

The writer is a critic, short story writer and a professor of Urdu at the University of the Punjab, Lahore. His book Jadeediat Aur Naubadiyat was recently published by the Oxford University Press.

Abrar Ahmad : Translations by Salma Jilani

A Song of Town boys

With the dewy eyes of your mornings we see you Our town of bygone days
We, the soulful singing birds Look for the shelters of your walls
We left to bring back kisses for your brows We will come back, with weary feet
To roam around in your darkened rooms
On your bosom
We will spread the flowers of our dreariness
With the wayward wind
We will walk on your empty roofs
We will fill our eyes with the smokes of your stoves
Rising from your courtyards
We will come to dry our eyes
With the dirty sleeves of your gleaming children
To embrace your mossy walls
We will come to spread *chorpoys
On roof tops of your nights
Taking rest in fragrance of sleep and childhood
Beyond your blooming jasmine
We will come back to you
To gather our screaming lonesomeness
We will see your aged bricks
with eyes burnt by sleeplessness of a lifetime
In the ditch of past
Surrounded by uneven houses
To fall again
To sleep for long again
We will come,
To become dust in your suburbs.

Salma Jilani

When eyes grow old

When eyes grow old
Things and faces become blurry
And the ache inside increases
In the hollowness of self

Wastefulness creates clamor
And a time comes
When love
Becomes more important than life
And this is the time
When loving faces
Start looking at you as strangers
But till turning into dust
Wait for love can never be over
This is the reason perhaps,
In front of me, present somewhere or vanished anywhere
Those mesmerizing, extremely adorable eyes
Like Tears
Start falling into my heart
My tears that I cannot wipe
I can only shed them from my eyes
That love,
Which perhaps is love or not…
All night long
I collect ashes of stars
And watch bright stars
Scattered all over
I remember those eyes
In which my sleepless nights can rest
From the ashes of burnt cigarettes
Thorns have grown from my insides
Dusty wind of inaccessibility and agony have started to blow
Carrying the sufferings
Of bleak hopes and longings
I enter each new day
In company of those eyes,
Who are with me,
Or perhaps not.

(Edited by Ambreen Salahuddin)

Salma Jilani originally from Karachi, Pakistan, now living in New Zealand is a fiction writer. Salma has translated many English poems of international poets into Urdu and has written literature for children.
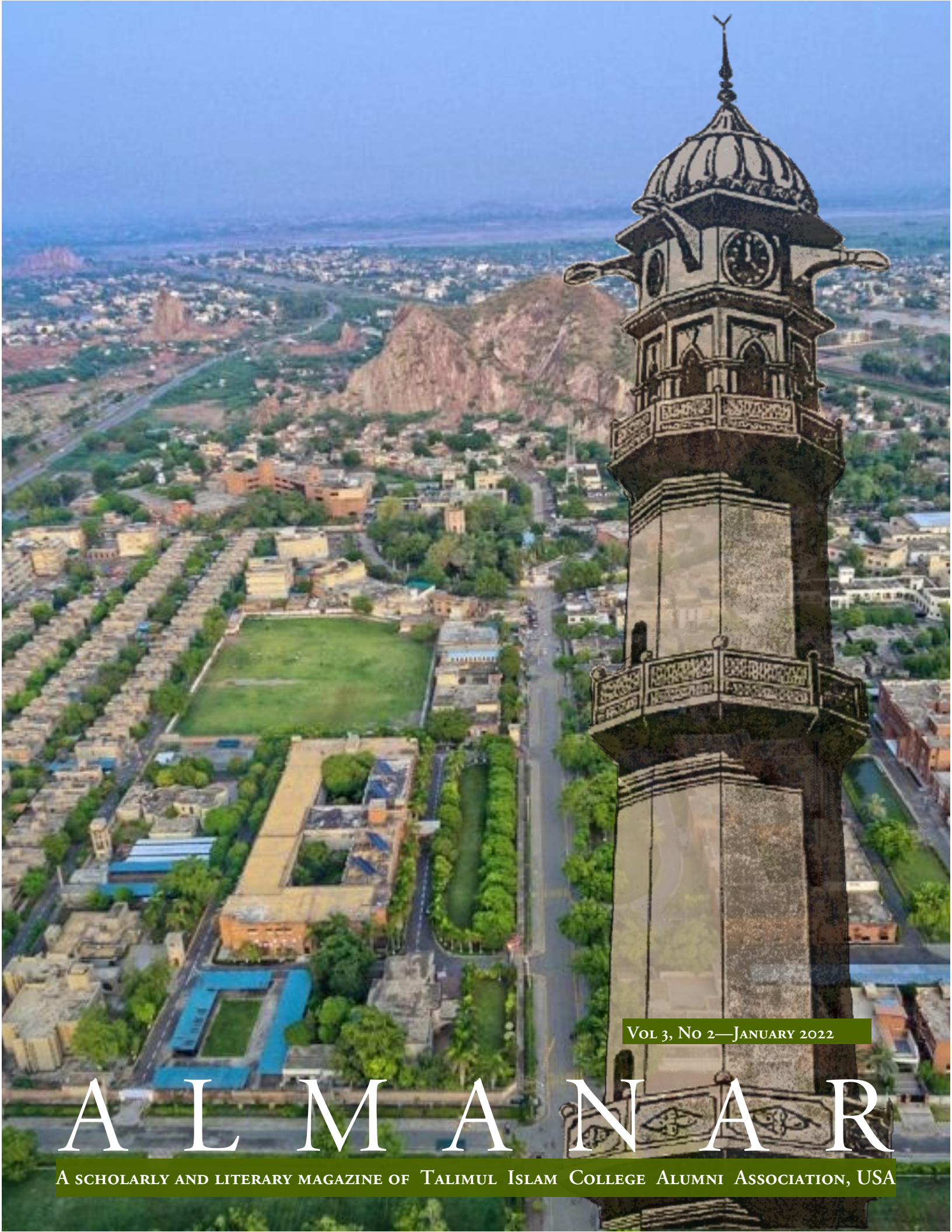
Vol 3, No 2—January 2022
ALMANAR
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA